کچھ
یادیں
کچھ
باتیں

شوکت تھانوی

کچھ یادیں کچھ باتیں

شوکت تھانوی

شمشاد علی فائنڈیشن
موضوع ماہ پور ڈاکخانہ فرید پور (آندر) ضلع سیوان
بہار (ہندوستان) ۸۴۱۲۳۱

کچھ یادیں کچھ باتیں

میری ابدی زندگی کا آغاز ایک عجیب ہنگامہ سے ہوابیلکہ میں تو اس کو ایک ہنگامہ سے زیداہ شامت ہی کہوں گا۔ جس طرح شامت بغٗر کسی اطلاع کے آجایا کرتی ہے اسی طرح مجھ پر یہ سانحہ گزرا کہ میں بیٹھے بیٹھائے شاعر بن گیا حالانکہ مجھ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ والدمحترم میرا نالائق نکل جانا اور میرا شاعر بن جانا یکساں قسم کی بات سمجھیں گے اس لئے میں ایک چچازاد بھائی کے متعلق ان کی اس رائے سے پوری طرح آگاہ تھا جو ان کے شاعر نکل جانے کے بعد والدمحترم نے قائم کر رکھی تھی مگر ان بھائی جان کی شاعرانہ عظمت کا میں کچھ ایسا قائل تھا کہ خود اپنے کو بھی شاعر بنائے بغیر نہ رہ سکا شروع شروع میں تو شاعری کی کچھ ”پراوئیٹ پریکٹس“ کرتا رہا۔ جس میں چوری اور سینہ زوری دونوں کو دخل تھا کہ انھیں بھائی جان کا کلام نقل کر کر کے اپنے دوستوں میں لے جاتا تھا اور ان کی تخلص کی جگہ اپنا تخلص فٹ کر کے اپنے دوستوں کو وہ کلام لہک لہک کر سناتا تھا۔

اس سے قبل کہ میں کچھ اور عرض کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تخلص والی بات نہ رہ جائے کہ میں نے شوکت تخلص کیوں رکھا۔ بات یہ کہ جس زمانہ میں میں شاعر بن رہا تھا۔ علی ب۴رادران اور مہاتما گاندھی کا بڑا نام تھا۔ اب یا تو میں اپنا تخلص گاندھی رکھ سکتا تھا، ورنہ علی برادران میں سے کسی کا نام اپنے تخلص کے لئے منتخب کر سکتا تھا، مولانا محمد علی کے نام کے دونوں اجزا مجھے تخلص کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوئے، البتہ مولانا شوکت علی ک شوکت میرے دل میں اتر گیا۔ پھر اس تخلص کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بھائی جان کا تخلص ارشد ہٹا کر اس شوکتک کو نہایت آسانی سے فٹ کیا جا سکتا تھا لہٰذا میں نے اس اعتبار سے بھی اس تخلص کو اپنے لئے مناسب

سمجھا اور بھائی جان کے مقطعوں میں اسی کو رکھ رکھ کر اپنے دوستوں کو سناتا رہا۔ مگر ایک دن ناگاہ ایک غزل مجھ سے سرزد ہوگئی اور کچھ نہ پوچھئے میری خوشی کا عالم جب میں نے اپنی ذاتی پہلی غزل مکمل کر کے احباب سے داد حاصل کی ہے مگر چونکہ یہ چوری کی غزل نہ تھی لہٰذا بے ساختہ جی چاہنے لگا کہ یہ غزل میرے نام سے کہیں نہ کہیں چھپ ضرور جائے۔ میں نے اس غزل کی کئی نقلیں کیں اور اپنے گھر آنے والے تمام ادبی رسالوں کے پتہ پر ایک ایک نقل اس اپیل کے ساتھ روانہ کردی کہ ؎

بہرِ خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجئے

جس شامت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ یوں آئی کہ ایک دن ڈاک میں مجھ کو اپنے نام آیا ہوا ایک رسالہ ملا۔ میر نام ایک رسالہ کا آنا ہی میر لئے کیا کم اہم تھا کہ اب جو اس کو کھول کر دیکھتا ہوں تو اس میں میری وہی غزل ’’رنگِ تغزل‘‘ کے زیرِ عنوان چھپی ہوئی تھی اور عنوان کے نیچے میرا نام بھی نہایت نمایاں حروف میں درج تھا۔ ’’نتیجۂ فکر شیخ محمد عمر صاحب شوکت تھانوی‘‘ کاش آپ کو یقین آجائے کہ مجھ کو اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ آسکا۔ بار بار آنکھوں کو ملتا اور شروع سے آخر تک اس غزل کو پڑھتا تھا۔ ہر چند کہ کسی طرح سیری نہ ہوتی تھی مگر اب جی چاہنے لگا تھا کہ گھر کے دوسرے افراد بھی اس غزل کو دیکھیں اور اندازہ کریں کہ اس میں ایک احیسا جوہر قابل بھی موجود ہے جو ایک ستارہ بن کر طلوع ہوا جس کو آفتاب بن کر نصف النہار پر پہنچنا ہے چنانچہ میں نے ایک چھوٹی سی میز ایک ایسے کمرے کے وسط میں رکھ دی سے سبھی کا گذر ہوتا رہتا تھا اور اس میز پر اسا رسالے کا وہی غزل والا صفحہ کھول کر رکھ دیا کہ اس کی زیارت سے ہر اہلِ بصیرت مشرف ہوسکے۔

سب سے پہلی نظر جس اہلِ بصیرت کی اس رسقالہ پر پڑی وہ والد صاحب قبلہ ہی تھے۔ پہلے تو یوں ہی سرسری نظر سے اس رسالہ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے مگر پھر ٹھٹکے۔ واپس لوٹے، رسالہ کو اٹھایا ور چشمہ لگا کر پوری توجہ سے اس کو دیکھتے رہے غالباً انھوں نے ایک مرتبہ پڑ رنا کافی نہ سمجھا اس لئے دیر تک پہلے تو اسی صفحہ کو دیکھتے رہے کہ اس کے بعد رسالہ کے باقی

صفحات پر بھی جستہ جستہ نظر ڈالی اور اٰخر اس رسالہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں سے والدہ محترمہ کو آواز دی:

’’میں نے کہا کہاں ہیں آپ ذرا تشریف لائیے۔‘‘

اس قسم کی آواز وہ عموماً اس مواقع پر دیا کرتے تھے جب ان کو والدہ محترمہ سے کسی کو شکایت کرنا ہوتی تھی۔ ورنہ عام حالات میں تشریف لانے کا ذکر نہ وہتا تھا۔ صرف اتنا ہی کافی ہوتا تھا کہ ’’ارے بھئی! میں نے کہا، سنتی ہو۔‘‘ لہٰذا ایک لواشناس کی حیثیت سے والدہ محترمہ فوراً سمجھ گئیں۔ کہ کسی نے کوئی گُل کھلایا ہے اور اس کی جواب دہی اب ان کو کرنا پڑے گی۔ وہ اس جواب دہی کے لئے تیار ہوتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچیں تو والد صاحب نے ان کو دیکھتے ہی کہا:

’’آپ کے صاحبزادے بلند اقبال فرماتے ہیں کہ ؎

ہمیشہ غیر کی عزّت تری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ اس نامعقول کوچہ میں جاتے ہی کیوں ہیں۔‘‘

والدہ بیچاری نے نہایت معصومیت سے فرمایا: ’’مجھے تو خبر نہیں کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے۔‘‘

والد صاحب نے فرمایا: ’’اور سنیئے فرماتے ہیں آپ کے فرزند ارجمند کہ ؎

انھیں جانبر کبھی ہوتے ہوئے دیکھا نہیں شوکت
جو عشقِ مرضِ مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں

مرض بھی ہوا تو وہ جس کی کمزوری کی وجہ سے مرض کی ’ر‘ تک متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے۔ مرض کی ’’ر‘‘ کو ساکن سمجھنے والا اگر شاعر ہوسکتا ہے تو تُف ہے اس شاعری پر اور جس رسالہ نے اس خرافات کو شائع کیا ہے۔ اسق کو تو میں کیا کہوں۔ ذرا اس رسالے کا اسم مبارک ملاخطہ ہو ’’ترچھی نظر‘‘ لاحول ولا قوۃ۔ اب یہ ادبی رسالوں کے نام ہونے لگے ہیں۔ ترچھی نظر بانکے

نسوریا۔ رنگیلے بالم۔ کچھ پلے بھی پڑا کہ واقعہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بلند اقبال چشم بدور شاعر ہوگئے ہیں۔ شوکت تخلص فرماتے ہیں اور اس بکواس کو غزل کہتے ہیں۔ پڑھے نہ لکھے نہ محمد فاضل۔ نہ صاحبزادے کا املا درست ہے نہ انشا اور چلے ہیں شاعری کرنے۔ اب نہ لکھنے کے رہیں گے نہ پڑھنے صرف شاعری کریں گے اور ترچھی نظر میں اپنا کلام چھپواتے رہیں گے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ آئندہ میں نہ سنوں کہ یہ شاعر ہیں اور آئندہ میں نہ دیکھوں کہ ان کی غزل کسی ترچھی نظر یا پتلی کمر میں۔''

لیجیے صاحب شاعری ختم۔ تخلص ضبط اور ہم رہ گئے برخوردار محمد عمر سلمہٗ قسم کے ایک خالص طالب علم۔ مگر مثل مشہور ہیکہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ رسالہ ترچھی نظر لاکھ ترچھی نظر سہی مگر اس نے ہماری پہلی غزل چھاپ کر وہ احسان کیا تھا کہ اس کے ایڈیٹر کا شکریہ ادا نہ کرنا ایک عجیب بداخلاقی سا محسوس ہونے لگا۔ آخر ایک دن میں اس دفتر میں جا پہنچا اور اس کے ایڈیٹر امین سلونوی صاحب سے تعرف حاصل کرلیا۔ امین سلونوی صاحب تو واقعی بانکے سنوریا نکلے مونچھوں کی جگہ لبوں میں دو ابابیلیں دبائے کسی ترک جرنیل کی طرح اپنے دفتر میں بیٹھے ملے۔ موچھیں دیکھ کر تو ڈر معلوم ہوتا تھا مگر ان مونچھوں کے نیچے سے وہ آدمی بہت ملنسار نکلے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ پیش آئے اِدھر اُدھر کی باتں و کے بعد شکایت کی کہ ایک غزل کے بعد پھر آپ نے ''ترچھی نظر'' کو بھلا ہی دیا۔ عرض کیا۔ جی ہاں، وہی اکلووتی غزل تھی جو یہمارے لئے بھاگوان ثابت ہوسکی اور غزل کے سلسلہ کی تمام بپتا کہہ سنائی۔ بپتا غلباً اسی مصیبت کو کہتے ہیں جو باپ کی طرف نازل کی جائے۔ اس بپتا میں زیادہ زور سا بات پر دیا کہ آپ کے رسالئہ کا نام ترچھی نظر ہمارے حق میں بے حد قاتل ثابت ہوا اس لئے والد محترم کو اس ترچھی نظر پر خصوصیت سے اعتراض تھا۔ امین سلونوی صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی کہ دراصل یہ نام محض ''ترچھی نظر'' نہیں ہے بلکہ ''ترچھی نظر بلدۂ لکھنؤ'' ار واس سے تاریخ نکلتی ہے۔ عرض کیا کہ ایسی بھی کیا تاریخ نکالنا کہ خود آ نے ہماری ہی تاریخ وفات نکلوا کر رکھ دی۔ امین سلونوی صاحب نے بتایا کہ

وہ خود اس نام کو تبدیل کرنے والے ہیں اور اس کا نام اب صرف ''نظر'' رکھنے والے ہیں۔ عرض کیا کہ آپ نے اس کا یہ شریفانہ نامک رکھ دیا تو اس میں پچھ نہ کچھ لکھنے کے باوجود شاید ہم بھی والد محترم کے ''نورِنظر'' رہ سکیں۔

حسب وعدہ امین لونوی صاحب نے ''ترچھی نظر'' کا اگلا نمبر ''نظر'' ہی کے نام سے شائع کیا اور والد صاحب نے اس کو صرف ''نظر'' دیکھا تو یہ فرمایا کہ ''الحمداللہ اس کا ترچھا پن تو دور ہوا۔'' مگر باوجود اس الحمدللہ کے میں نے پھر کوئی غزل اس میں یا کسی اور رسالہ میں نہ چھوائی البتہ امین سلونوی صاحب کے بے حد اسرار پر ایک مضمون ''میٹھے چاول'' کے نام سے لکھا۔ یہ میری پہلی نثری کابش تھی اور یہ میرا پہلا مصمون ہی مزاحے تھا۔ جب یہ مضون رسالہ ''نظر'' میں چھپ کر آیا تو اس غزل ہی والئے تیوروں کے ساتھ والد محترم نے اس کو پڑھا مگر اس مرتبہ والدہ محترم کی پیشی نہیں ہوئی اور نہ اس مضمون میں کسی متحرک یرف کو ساکن کہہ کر لاحول بھیجا گیا بلکہ ایک عجیب و غریب منظر ایک دن یہ دکھائی دیا کہ والد صاحب وہی مضمون اپنے ایک دوست کو بیٹھے سنا رہے تھے اور وہ دوست یہ تبصرہ کر رہے تھے کہ ان برخوردار کے اس شوق کو ختم نہ ہونے دیجیے۔ شاعری کے متعلق تو مجھ کو بھی آپ کے رائے سے اتفاق ہے مگر اس مضمون کے پالنے میں اس بچے کے پیر نظر آرہے ہیں۔ والد صاحب کا البتہ کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ان کی رائے کیا تھی مگر اپنے دوست کو یہ مضمون سنانے سے اندازہ تو یہی ہوا کہ وہ غالبًا خوش ہوئے ہیں۔ لہٰذا نثری مضامین تو جاری رہے البتہ شاعری کی پھر ہمت نہ ہوسکی اور جب امین سلونوی صاحب نے بہت ہی ناک میں دم کر دیا تو ان سے صاف صاف کہہ دینا پڑا کہ اول تو مجھے عاق ہونا نہیں ہے دوسرے شعر کہنے کے لئے جس سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے اس سے میں بے بہرہ ہوں۔ اللہ جانے پھر کس متحرک حرف کو ساکن باندھ کر خود بندھ جاؤں اور بندھا ہوا مار کھاؤں۔

امین سلونوی صاحب خود بھی ذرا میرے ہی ایسے شاعر تھے مگر ان کو مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل تھا لہٰذا ان کا کلام مولانا آسی کی نظر سے گذرنے کے بعد جملہ اسقام

سے پاک ہوکر سامنے آتا تھا وہ اکثر مولانا آسؔی کے اشعار سنایا کرتے تھے اور ان کے تجر کے چرچے کیا کرتے تھے ایک دن انھوں نے مولانا کا ایک شعر سنایا۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہوکر ہم نے آئینے وفا بدلہ

یہ شعر میرے دل کو ایسا لگا کہ میں متواتر کئی دن تک اس شعر کو گنگناتا اور وجد کرتا رہا۔ آخر اسی شعر کی کیفیت میں ڈوبنے کے بعد جب میں ابھرا تو امین سلونوی صاحب سے استدا کی کہ میں بھی اگر شعر گوئی میں کسی کی رہنمائی قبول کرسکتا ہوں تو وہ یہی شخص ہے جس نے یہ شعر کہا ہے چنانچہ امین صاحب کی معیت میں اسی دن میں مولانا سے نیاز حاصل کرنے ایک نہایت بوسیدہ مکان کے دروازے پر موجود تھا۔ امین صاحب کے آواز کے جواب میں آواز آئی کہ تشریف لے آیئے۔ اور میں امین صاحب کے پیچھے پیچھے ایک ایسے مکان میں داخل ہوا جو مکان کم اور چڑیا خانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا بے شمار کبوتر اس مکان کے صحن میں غٹرغوں کرتے پھر رہے تھے اور اس کے غول میں چند مرغیاں بھی کٹکٹاتی پھر رہی تھیں۔ ایک طرف طوطے کا ایک پنجڑہ لٹکا ہوا تھا اور عین اس وقت جب کہ اس جانور کو دیکھ رہا تھا نہایت پھرتیلا خرگوش ایک بلی کے مراقبہ میں مخل ہوتا ہوا ایک تخت کے نیچے گھستا نظر آچکا تھا۔ اسی تخت پر وہ صاحبان بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے اور میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے کہ ان دونوں میں سے کوئی مولانا آسؔی نہ ہوں اس لئے کہ ایک صاحب تو اس قدر زائدالمیعاد بزرگ تھے کہ غالباً ملک الموت کی بھول چوک میں پڑے ہوئے تھے اور دوسرے صاحب نہایت میلے پاجامہ پر نہایت صاف شفاف قمیض پہنے معلوم نہیں اپنے حریف کو مارنے کی فکر میں تھے یا اس کے کسی مہرے کے لئے پینترا بدک رہے تھے جب میں یہ الجھا دینے والا کھیل دیکھ کر یہاں سے بھاگ نکلنے کے لئے راہِ فرار تجویز کرنے لگا تو میلے پاجامہ اور صاف قمیض والے محترم نے بڑے فخر سے جھومتے ہوئے کہا۔ چال واپس نہ ہوگی یہ شہ اور یہ مات، خدا خدا کرکے وہ بازی خْتم ہوئی تو امین صاحب نے

انھیں میلے پاجامہ اور صاف قمیض والے بزرگ پر یہ تہمت لگائی کہ ”آپ ہی ہیں علامہ عبدالباری آسؔی۔“ اور فوراً ہی میرا تعارف بھی ان سے کرادیا گیا۔ مولانا بڑے تپاک سے ملے۔ امین صاحب کی درخواست پر تقریباً بادلِ ناخواستہ اپنی وہی غزل ارشاد فرمائی جس کا ایک شعر میں تین دن سے نگنا تا پھر رہا تھا اور اس کے بعد امین سلونوی صاحب ہی نے میری اس خواہش کا اظہار کیا کہ مولانا سے شرفِ تلمّذ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے اس درخواست کو منظور تو فرمالیا مگر میں اب تک اس شش و پنج میں تھا کہ اگر میری شاعری کی والد محترم کو پھر اطّلاع ہوگئی تو کیا ہوگا مگر یہ کہنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ میں بصیغۂ راز شاعر بننا چاہتا ہوں۔ اور جب تک والد صاحب اجازت نہ دے دیں انڈر گراؤنڈ رہنا چاہتا ہوں۔

☞

۲

مولانا عبدااری آسؔی سے شرفِ تلمذ حاصل کرنے بعد شاعری بڑے زور کے ساتھ جاری ہوچکی تھیمگر شور کے ساتھ جاری کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مبادا والدمحترم کو خبر ہو جائے اور ادھر تو اصلاحِ سخن ہوتی رہے ادھر ''مرمتِ سخنور'' کی نوبت آجائے۔ مولانا آسؔی کو بھی یہ بات بتائی جا چکی تھی کہ میں ذرا ''کانفی ڈینشل قسم کا شاعر'' بننا چاہتا ہوں اور اپنی شاعری کو پردہ نشیں رکھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا مشاعروں کی شرکت سے معذرت چاہوں گا ویسے مشقِ سخن جاری رکھوں گا۔ مولانا آسؔی نہایت سمجھدار قسم کے بزرگوں میں سے تھے انھوں نے کبھی مجھ کو میری اس مجبوری پر عبور حاصل کرنے کے لئے نہ ابھارا اور مشاعرے میں شرکت پر مجبور نہ کیا البتہ میری غزلوں پر اصلاح برے خلوص اور نہایت توجہ سے دیتے رہے اس سے ایک فائدہ مجھ کو یہ بھی پہنچا کہ چونکہ میں ان کا ''مشاعرہ جاتی'' شاگرد نہ تھا لہٰذا مجھ کو انھوں نے ''آنریری'' شاعر بنانے کی کبھی کوشش نہ کی ورنہ میں نے ان کے شاگردانِ رشید کے لشکر جرار کی وہ پریڈ بھی نہایت عبرت سے دیکھی تھی جو مشاعرے کے دن ان کے درِ دولت پر ہوا کرتی تھی کہ یہ تمام شاگرد جمع ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذ اور ایک پنسل یا قلم ہے۔ کوئی کبوتروں کی ڈھابلی پر بیٹھا ہوا ہے کسی کو طوطے کے پنجرے کے عین نیچے جگہ ملی ہے۔ کسی کو بیٹھنے کے لئے مرغیوں کا ٹاپا مل گیا ہے۔ کچھ شاگرد تخت ٹکے ہوئے ہیں کچھ چارپائی پر اور ایک آدھ ایسا ہے جو کسی کونے میں ''کھڑا کھیل فرق آبادی'' کھیل رہا ہے۔ مولانا آنکھیں بند کئے حقہ کی نے مُنہ میں لئے فکرِ سخن میں محو ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ''آہاہا'' کہہ کر جھومتے ہیں آنکھیں کھول کر کہتے ہیں۔ جوّاد

صاحب آپ لکھ لیجئے یہ مطلع اور ترنم کے ساتھ مطلع پڑھ کر جوّاد صاحب کو لکھوا دیتے ہیں اس سے کوئی بحث نہں ے کہ جوّاد صاحب نے اس مطلع کا املا بھی درست لکھا ہے یا نہیں۔ مولانا پھر فکرِ سخن میں ڈوب گئے اور جب کوئی شعر لے کر ابھرے تو پھر پہلے ''آہاہا'' اور اس کے بعد آنکھیں کھول کر جھومتے ہوئے ارشاد کیا کہ ''منور صاحب! یہ شعر آپ لکھ لیجئے۔'' اسی طرح باری باری وہ سب کو شعر لکھوائے چلے جاتے تھے اور سب شاگردوں کے سادہ کاغذ سیاہ ہوتے جاتے تھے۔ گھنٹوں کی اس بیگار کے بعد کوئی گیارہ شعر کی شعر کی غزل لے کر رخصت ہو جاتا تھا کوئی سات شعر کی اور کوئی تیرہ شعر کی اور ان سب کے رخصت ہو جانے کے بعد مولانا خود اپنے لئے غزل کہتے تھے جس کا سلسلہ سرِ مشاعرہ بھی جاری رہتا تھا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے اور مولانا شعر بھی کہہ رہے ہیں دوسرے شعراء کو داد بھی دیتے جا رہے ہیں بظاہر ان کا کلام بھی سن رہے ہیں مگر دراصل خود اپنی غزل مکمل کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ کا ایک لطیفہ میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ مشاعرے میں ایک شاعر نے مصرع پڑھا۔

گری ہے برقِ میرے آشیانے پر

اور مولانا نے اپنے نزدیک یہ مصرعہ یوں اٹھایا کہ۔

ستم ظریفی قدرت نے تہمتوں کے لئے

وہ گویا اس شاعر کے بجائے عالِ محویتے میں اپنا ہی مصرع پڑھ گئے تھے، چنانچہ ان کو ایک آدھ قریب بیٹھے ہوئے شاعر نے گھور کر دیکھا بھی کہ یہ مصرع کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ شاعر پڑھ رہا ہے زمین کی اور یہ سن رہے ہیں آسمان کی۔ میں اکثر مولانا کے ان شاگردوں کے متعلق جو ''آنریری شاعر'' بنے ہوئے تھے غور کیا کرتا تھا کہ جب یہ خود شعر کہتے ہی نہیں ہیں تو آخر ان کو کس حکیم نے نسخہ میں لکھ دیا ہے کہ تخلص پاتے پھرو اور غزل پڑھو ضرور۔ خیر اس کا تو ذکر نہیں خود مولانا آسؔی کی یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اتنے مفروضہ شاعروں کو کیوں سمیٹے ہوئے ہیں

اوران کواپنا بھیجہ کیوں تناول کراتے ہیں مگر دراصل یہ تھی کہ اکھاڑہ بازی کی بات کہ کسی اوراستاد سے ہمارے شاگردوں کی تعداد کم نہ رہ جائے ورنہ ہم ذرا کم درجہ کے استاد سمجھے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں ایک اوراستاد کا لطیفہ بے قرار ہے کہ اس کوضرور پیش کردیا جائے ان استاد کے شاگرد ایک نیا شاگردی کا امیدوار پھانس لائے تو اس استاد نے اس شاگرد کو مرعوب کرنے کے لئے جہاں اور بہت سی باتیں کہیں وہاں یہ بھی کہہ دیا کہاس وقت اطراف ملک میں میرے سولہ سو شاگرد ہیں۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر جب وہ نیا شاگرد چلا گیا تو اس کو پھانس کرلانے والے شاگرد نے اپنا سر پیٹ لیا کہ استاد آج تو آنے لُٹیا ہی ڈبودی کہ اس کہہ دیا کہ میرے سولہ سو شاگرد ہیں حالانکہ میں سولہ۰ ہزار کہہ کرلایا تھا۔'' مختصر یہ کہ یہ استادی شاگردی کا اکھاڑہ بازی کا معاملہ تھا اور ان رموز کو سمجھنے سے میں قاصر تھا مگر چونکہ میں مولانا کا ''مشاعرہ جاتی'' شاگرد نہ تھا۔ لہٰذا اس طوفانی ماحول میں اصلاحِ سخن کے لئے کبھی میں نے حاضری نہ دی اور جب کبھی باریاب ہوا انتہائی پُرسکون لمحات میں باریاب ہوا تاکہ وہ توجہ سے میری غزل دیکھیں، اس کی غلطیاں اور خامیاں میرذہن نشیں کرائیں اوراپنے اصلاحی نکتے مجھ کو سمجھائیں۔ یہ سلسلہ جاتی تھا اور کئی سال سے جاتی تھا کہ ایک روز مولانا آسیؔ نے فرمایا پنڈت جگت موہن لعل رواں نے اناؤ میں ایک مشاعرہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی چلیں۔ یہ لکھنؤ کا مشاعرہ تو ہے نہں ے کہ آپ کو اپنی شاعری کی بے پردگی کا خوف ہو، مولانا نے پہلی مرتبہ یہ بات کہی تھی۔ مشاعرہ بھی لکھنؤ سے یعنی والدمحترم سے دور اناؤ میں تھا۔ لہٰذا میں ہمت کر کے تیار ہوگیا طرح غالبؔ کی تھی ؎

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

میں نے بڑی محنت سے غزل کہی۔ مولانا آسیؔ نے بھی اس غزل کو خصوصیت کے ساتھ پسند کیا۔ چونکہ پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھنے کا اتفاق ہورہا تھا لہٰذا اس کی دھن بھی غسل خانوں میں چھپ چھپ کرکر بیٹھائی اس زمانے میں آواز بھی آج کل کی سی بھیانک نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ مشاعرے میں غزل خوب چمکی مگر جب غزل چمک چکی تو ایک بجلی بھی مجھ ھ پر یہ گری کہ اسی مشاعرے کے ایک

شاعر مرزا فخر اللہ بیگ مشاعرے کے بعد میرے پاس آئے، نہایت شفقت سے دلودی، بڑی دیر تک گلے لگاتے رہے اورآخر میں یہ کہہ کر میرا دم نکال لیا کہ وہ ولد محترم کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ہیں لہٰذا مجھ کو مشاعرے میں سرسبز دیکھ کران کو بے حد مسرت ہوئی ہے۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ان کی یہ مسرت میرے لئے کتنی بڑی مصیبت بن کر رہ گئی تھی اور یہ سننے کے بعد سے میں کس قدر شدید اختلاج میں مبتلا تھا کہ اگران نامراد چچا نے والدمحترم سے اس مشاعرے کا ذکر کردیا تو خدا جانے ہم پر کیا قیامت ٹوٹے گی۔ چنانچہ وہی ہوا کہ واپس جا کران کمبخت چچا نے پہلا کام یہی کیا کہ دوسرے ہی دن والدمحترم کے پاس تشریف لاتے نظر آئے، میں ان سے اور والد محترم سے اپنے کو چھپا کر گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی مفقود ہوگیا۔ کئی مرتبہ مجھ کو آواز دی گئی مگر میں تو گدھے کے سر کے سینگ بن چکا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ یہ حضرت ٹلے اور میں ایک ودسرے راستہ سے نکل کر گھر کے باہر چلا گیا مگر آخر کہاں تک منہ چرراتا۔ دوسرے ہی میرا سامنا ہوتے ہی والدمحترم نے پہلی بات یہی کہی کہ:

''بھئی! تم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ کل شام مرزا فخر اللہ بیگ آئے تھے، تمہاری اناؤ اولی غزل کی بے حد تعریف کرتے تھے اور بار بار یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کوئی ارماں نکلا

دراصل یہ شعر میں نے یوں کہا تھا ؎

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا اک ارماں نکلا

مولانا آسیؔ نے اس میں ''کہ اک'' کے ٹکڑے کو کاٹ کر ''کوئی'' بنا دیا تھا۔ ہبرصورت والدمحترم نے اس بار بڑی رواداری کا ثبوت دیا تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اب میری شاعری کو شربت کا گھونٹ بنا کر پینے کو تیار ہوگئے تھے، لہٰذا اس نقاب کشائی کے بعد مجھ کو اپنی شاعری

چھپانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اتفاق سے ان ہی دنوں کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کے مالک حاجی محمد مصطفٰے خان صاحب کے یہاں اسی مصرع پر طرحی مشاعرہ ہوا اور مرزا فخر اللہ بیگ نے والد ہی کے ذریعے مجھ سے اس مشاعرہ میں شرکت کی تاکید کرائی، چنانچہ میں اس مشاعرے میں بھی شریک ہوا اور اس مشاعرے کے تیسرے دن حاجی محمد خاں صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''شوکت میاں اس روز مشاعرے میں آپ کی غزل سن کر میری بھتیجی زاہدہ نے نہ صرف ایک مرتبہ ہی آپ کی غزل سن کر یاد کرلی ہے بلکہ وہ بالکل آپ ہی کی طرح پڑھتی بھی ہے آپ اس سے یہ غزل ضرور سنیں۔ چنانچہ میں نے زاہدہ خاتوں سے یہ غزل سنی اور ان کی ذہانت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آگے بڑھ کر یہی زاہدہ خاتون خود بہت اچھی شاعرہ نکلیں اور جب ان کی شادی چوہدری خلیق الزماں سے ہوئی ہے تو میں ہی ان کے نکاح کا وکیل بھی مقرر ہوا تھا۔

اب گویا والد صاحب کو خدا نے صبر کی توفیق عطا کر دی تھی کہ جوان بیٹا شاعر نکل گیا ہے تو مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے اور اب وہ اس سلسلہ میں اپنی قسمت پر شاکر تھے۔ گھر پر اگر کبھی کوئی شاعر دوست آجاتا تھا تو اس کو بھی گوارہ لر لیتے تھے بلکہ اس حد تک گوارا کر لیتے تھے کہ ان ہی دنوں آگرہ سے مولانا سیماب اپنے شاگرد رشید بلکہ شاگرد قابل دید حضرت ساغر نظامی کی ادارت میں ایک رسالہ ُپیمانہ ٗ کے نام سے نکلوایا تھا اس رسالے کے بدبلت میرے ساغر صاحب سے خط و کتابت کے مراسم قائم ہو چکے تھے کہ ناگاہ ایک دن میری عدم موجودگی میں وہ آگرہ سے لکھنؤ آدھمکے۔ میرا تو اس زمانہ میں باہر کوئی کمرہ تھا نہیں وہ سیدھے والد محترم کے کمرے میں پہنچے۔ مجھ کو دریافت کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ میں موجود نہیں ہوں تو والد صاحب سے فرمایا کے میں شوکت صاحب کا مہمان ہوں نیند سے سخت بدحواس ہو رہا ہوں لہٰذا آپ اپنا بستر چھوڑ کر اندر تشریف لے جائیں اور میر لئے یہ بستر خالی کر دیں۔ وہ نہایت خاموشی سے اٹھے اور اندر جا کر والدہ صاحبہ سے فرمایا کہ ''باہر کا کمرہ اب صاحبزادہ کو دے دو۔ مجھ سے زیادہ ان کے ضروری ہو گیا ہے میں اندر ہی گذر بسر لر لوں گا۔ آگرہ سے ان کا ایک دوست آگیا ہے کھانے میں ذرا

اہتمام کرا دینا۔'' میں جب گھر واپس آیا ت و والدہ محترمہ نے سارا ماجرا سنایا۔ باہر جا کر دیکھا تو ساغر صاحب والد محترم کا بستر لپیٹ کر اپنا بستر بچھا چکے ہیں اور اپنے تکیوں پر عطر مجموعہ مل رہے ہیں اور خود بھی نہایت ۔

خراماں خراماں معطّر معطّر

قسم کے ''شے لطیف'' ہیں سر پر ریشمی سنہری بالوں کا ایک ٹوکرا سا رکھے ہوئے ایک پیکر لطیف بصد رعنائی میر سامنے موجود تھا۔ میں نے ''السّلام علیکم'' کے بعد اپنا تعرف کرایا کہ میں ہو ل شوکت۔ ساغر صاحب نے اپنا دستِ ناز پیرا مصافحہ کے لئے میر ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا:

''آپ کا جو ہیولہ میرے جوفِ دماغ میں محدود تخیّل تھا وہ اس سے قطعاً مختلف تھا جو آپ اصالتاً ہیں۔''

ارادہ کیا کہ دوڑ کر اندر جاؤں اور لغت اٹھا لاؤں مگر پھر خیال آیا کہ ادبی گفتگو بخود مجھ کو بھی کرنا چاہیئے۔ لہٰذا عرض کیا:

''اور آپ کا پیکرِ جمیل جو میرے تصوّرات میں رقصاں تھا وہ آج بغیر صفت میری نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے۔''

ساغر صاحب نے فرمایا۔ ''چائے کی خواہش شدید محسوس کر رہا ہوں'' عرض کیا ''مع لوازم وفواکہات پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔''

ساغر صاحب سے تفصیلی باتیں ہوئیں تو سلیس اردو کی نوبت پہنچ چکی تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ میرے متعلق شدید غلط فہمی میں مبتلا تھیا ور اپنے رسالہ پیمانہ کی اقتصادی بدحالی کا مجھ سے مداوا حاصل کرنے آئے تھے مگر جب انھوں نے مجھ کو بالکل ایک ایسی چیل پایا جس کے گھونسلہ میں ماس نہیں ہوتا تو صرف اتنی اعانت چاہی کہ میں ان کے لکھنؤ سے گورکھپور پہنچنے کا انتظام کر دوں جو کر دیا گیا اور ساغر صاحب گورکھپور روانہ ہو گئے، مگر ابھی میں ان کو اسٹیشن پر گورکھپور کی گاڑی میں سوار کر کے واسپ ہی آیا تھا کہ ایک اور بزرگ محترم مع اپنے سامان کے تشریف لے آئے۔ معلوم

ہوا کہ آپ حضرت علامہ سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی ہیں۔ حضرت علامہ نے آتے ہی ساغر صاحب کے متعلق کچھ حد سے زیادہ تشویش کے ساتھ دریافت مرمایا اور جب ان کو میں نے یہ بتایا کہ ابھی گورکھپور روانہ ہوچے ہیں تو حضرت علامہ کچھ دل گرفتہ سے بیٹھ گئے۔ دیر تک خاموش رہے۔ پھر کچھ سرد آہیں بھریں اور جس وقت مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ گورکھپور دوسری ٹرین کس وقت جاتی ہے تو میں نے دیکھا وہ آبدیدہ بھی تھے۔ میں نے عرض کیا، کہ دوسری ٹرین رات کو جاتی ہے جو صبح گورکھپور پہنچتی ہے تو مولانا نے اپنے آ کو بہت کچھ سنبھالتے ہوئے کہا:

”برا کیا، ساغر صاحب نے بہت برا کیا۔ ان کو گورکھپور نہ جانا تھا۔ وہاں وصلؔ ہوگا۔“

میں یہاں ہجر دیکھ رہا تھا تو ظاہر ہے کہ وہاں وصل ہوگا مگر مولانا نے فوراً ہی مجھ کو سمجھا دیا کہ ورکھپور میں وصلؔ بلگرامی ہے وہاں ساغر صاحب کا جانا مناسب نہ تھا۔ مولانا بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ ساغر صاحب نے بڑا کیا۔ بہت برا کیا۔ ان کو وہاں نہ جانا تھا۔ میں نے چائے پیش کی۔ انکار۔ رات کا کھانا پیش کیا۔ انکار۔ اور بات کے جواب مے ں یہی فقرہ کہ ساغر صاحب کو گورکھپور نہ جانا تھا وہاں وصل ہوگا۔

مولانا کی حالت اس قدر قابلِ رحم ہو رہی تھی کہ رات جب وہ گورکھپور جانے لگے تو والد محترم نے کچھ رقم مجھ کو دے کر فرمایا کہ بیچارے سخت پریشان ہے ں تم گورکھپور تک ان کو پہنچا آؤ، لہٰذا مجھے مولانا کے ساتھ گورکھپور جانا ہی پڑا۔

☞

۳

ایک قد آدم ٹماٹر۔ چہرہ پر نہایت نورانی کھچڑی داڑھی جس میں بالوں کے کچھ گنگا جمنی کیفیت اختیار کر رکھی تھی کہکچھ بال تو سفید ہوچکے تھے اور جو باقی تھے سفید ہونے کے لئے بھورا رنگ دے رہے تھے کہ اس تیزی میں زبان بار بار پھسلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور شبہ ہوتا تھا کہ خیر سے جناب ہکلے بھی ہیں حالانکہ اچھے خاصے تھے صرف شوق یہ تھا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بات کر جائیں۔ تاکہ سننے والا مفہوم کے پیچھے دوڑتا رہ جائے۔ یہ تھے مولانا وصلؔ بلگرامی۔ سید مقبول حسین مولانا وصلؔ بلگرامی۔ جن کو ساری دنیا تو وصلؔ بلگرامی کہتی تھی مگر مولانا نیاز فتحپوری کو ایک دن یکا یک یہ خیال آیا کہ ان کی بیگم نے ہمیشہ ان کا تخلص نہیں بلکہ نام لیا ہے اور ساری دنیا کے خلاف وہ وصل صاحب کو مقبول صاحب کہتی ہیں۔ آخر نیاز صاحب کو پوچھنا پڑا کے یہ قصہ کیا ہے۔ آخر کو ساری دنیا تو ان کو وصل صاحب کہتی ہے اور تم مقبول کہتی ہو۔ بیگم صاحبہ نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا ”تو کیا میں بھی گالی بکنے لگوں۔“ میں نے وصل صاحب کو پہلی نظر میں واقعی ٹماٹر دیکھا تھا مگر بعد میں ایسے مرحلے بھی سامنے آئے جب وصل صاحب شعر سناتے وقت یا کسی بحث میں حصہ لیتے ہوئے ٹماٹر اور چقندر کا مصالحتی فارمولہ بنے ہوئے نظر آئے گورکھپور کے رئیس اعظم مولوی سبحان اللہ صاحب کی ریاست کے منیجر تھے۔ مولوی سبحان اللہ صاحب پاکستان کے مشہور سوشل ورکر بیگم سروری عرفان اللہ کے خسرم محترم تھے جن کے علمی تجّر اور جن کی اور ادب نوازی کا بڑا شہرہ تھا اور جن کے گرد اہل علم و اہل ادب کے جمگھٹے رہتے تھے۔ ساری رات محفل گرم رہتی تھی اور صحری کے ٹھنڈا کھا کر اہلِ محفل سونے کے لئے جا تھے اور چونکہ آنکھوں ہی آنکھوں

میں ساری رات کاٹ کر صبح کے وقت سوتے تھے لہٰذا ظاہر ہے کہ ناشتہ غائب ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا سہ پہر کو چار بجے ہی کھایا جا سکتا تھا مگر جس وقت میں مولانا سیمابؔ کے ساتھ وصلؔ صاحب کے یہاں پہنچا ہوں ہر چند کے بصبح کے سات بجے تھے مگر وصلؔ صاحب نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ ایک کرسی پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا ’’داغ فراق وصحبت سب کے جلے ہوئے‘‘ بیٹھے ہوں اور ساغرؔ صاحب اس طرح سو رہے تھے کہ گویا۔

حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

وصل صاحب نے سیماب صاحب کا نہایت سرد مہری کے ساتھ خیر مقدم کیا مگر مولانا سیمابؔ نے اس کا نوٹس لئے بغیر ساغر صاحب کو بیدار کیا جو فتنہ بن کر بیدار ہوئے اور رفتہ رفتہ قیامت بن کر وصل صاحب پر ٹوٹ پڑے اور سیماب صاحب سے ان کے متعلق قاموسی زبان میں جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم میرے پلے پڑ سکا وہ یہ تھا کہ جس مہم پر وہ گورکھپور آئے تھے وہ کب کی کامیاب ہو چکی ہوتی، اگر وصل صاحب بقول ساغر صاحب کے تعاون میں بخل سے کام نہ لیتے۔‘‘ معلوم یہ ہوا کہ مولوی سبحان اللہ صاحب نے رسالہ پیمانہ کی اعانت کے لئے ایک رقم کی منظوری دے دی تھی مگر وصلؔ صاحب نے اس رقم کی فراہمی کے ایسے عذر پیش کئے کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا یہ سن کر وصلؔ صاحب نے ٹماٹر سے چقندر بننے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی جلدی نہ جانے کیا کیا کہا۔ کچھ منہ سے جھاگ اڑا، کچھ کرسی کے ہتھے پر گونسے مارے، کچھ گلے کی رگیں پھلائیں اور آخر میں ان کے یہ الفاظ پلے پڑ سکے کہ ’’تہمت ہے، افترا ہے، بہتان تراشی ہے۔‘‘ ساغرؔ صاحب نے اپنے چوڑی دار پاجامہ کی چوڑیاں مرتب کرتے ہوئے فرمایا۔ ’’مولانا امین آپ کی ان باتوں سے متسلّی نہیں ہو سکتا۔‘‘ مولانا سیمابؔ نے جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا متسلّی؟ خوب، بہت خوب، کیا اختراع کیا ہے، کیا اجتہاد کیا ہے۔ متسلّی نہیں ہسکتا۔ یعنی تسلّی نہیں ہو سکتی مجھ کو۔ اس لفظ کو رواج میں لانا چاہئے‘‘ اور وصل صاحب اسی پر اُلجھ پڑے کہ یہ لفظ غلط ہے اور غلطی کو رواج دینا شدید تر غلطی۔ اسکا نتیجہ ایک نئی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ میں اس

جنگ کا اپنے کو واحد شہید سمجھ رہا تھا اس لئے کہ دس بج چکے تھے اور ناشتہ اس طرح غائب تھا کہ اپنے معدے کو کسی طرح ’’متسلّی‘‘ نہ کر سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے نہایت واہیات قسم کا ایسا ناشتہ سامنے آیا جو خود ہی ہمارا ناشتہ کر جانے والا نظر آ رہا تھا مگر اس وقت یہ بھی غنیمت نظر آیا۔ اس ناشتہ کے دوران اور ناشتہ کے بعد بھی میدانِ جنگ گرم رہا بلکہ جب رات کو میں اس ممیدان سے بھاگا ہوں تو یہ جنگ پوری گھما گھمی سے جاری تھی۔

یہ تھی وصلؔ صاحب سے پہلی ملاقات مگر اس کے بعد جب وہ مولوی سبحان اللہ صاحب کے یہاں سے سبکدوش ہو کر مستقلاً لکھنؤ آ گئے اور اپنا ادبی ماہنامہ ’’مرقع‘‘ کے نام سے جاری کیا اور اپنا ’’مقبول المطابع‘‘ قائم کیا تو ان سے بڑی تفصیلی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور اب معلوم ہوا کہ وہ تو واقعی نپولین کی قسم کے آدمی ہیں جن کی لغت میں لفظ ناممکن ہے ہی نہیں مشکلات کے پہاڑ ان کے سامنے پیش کر دیجئے وہ ان پہاڑوں کو پانی کی طرح بہا دیں گے اور اس پانی میں تیرتے ہوئے نظر آئیں گے اپنی بزرگی اور اپنی داڑھی سے جتنا کام وصلؔ صاحب نے لیا ہے، شاید ہی کبھی کسی نے لیا ہو ایک دو واقعات ہوں تو بیان بھی کئے جائے وہاں تو روز کا مشغلہ ہی یہ تھا کہ کوئی مشکل پیدا کی جائے اور اس پر عبور حاصل کیا جائے۔ خطروں سے کھیلنا اور سلامتی سے نکل جانا اس فنکار کا ایسا کمال تھا جو کسی اور میں کبھی نہ دیکھا گیا۔ اس کمالِ فن کی ایک آدھ مثال دیئے بغیر یہ بتانا ہی ناممکن ہے کہ وہ کیا قیامت تھا۔

ایک شاعر مگر ساتھ ہی ساتھ کھاتے پیتے دوست کو یکا یک صاحبِ دیوان بننے کا شوق پیدا ہوا پیدا ہوا اپنی زندگی بھر کی ادبی کمائی یعنی اپنے کلام کو بڑی احتیاط سے یکجا کیا۔ مخلص احباب سے اس کا انتخاب کرایا اور اس کی طباعت کا مہتم بالشان پروگرام بنا کر سب سے پہلے وہ کانپور سے چل کر دہلی پہنچے تا کہ رسالہ نئی روشنی کے کاتب سے اس کی کتابت کرائیں جس کا خط ان کو بے حد پسند تھا۔ دہلی میں محض کتابت کرانے کے لئے ہوٹل میں مہینوں قیام کیا اور زیر بار ہوتے رہے مگر اپنے کلام کی کی کتابت اپنی ہی نگرانی میں کراتے رہے۔ خدا خدا کر کے جب یہ دیوان کتاب تکے

مرحلے سے نکل آیا تو اب ان کو ایک ایسے مطبع کی ضرورت پیش آئی تو جو اسی احتیاط اور اسی توہ کے ساتھ طباعت کی منزل بھی سر کرا دے، نظر انتخاب وصل صاحب کے مقبوک المطابع پر پڑی سا لئے کہ وصل صاحب دیرینہ کرم فرما بھی تھے اور طباعت کے معاملے میں اپنے مطبع کا بھرم بھی قائم کر چکے تھے لہٰذا دیوان چھپوانے کے یہ دیوانے دہلی سے سیدھے لکھنؤ پہنچے اور وصل صاحب سے مل کر سارا ماجرا کہہ سنایا کہ اس طرح ہے کتابت کرائی ہے اور کتابت کے شانِ شان صرف آپ ہی کا مطبع اس کی طباعت کرا سکتا ہے وصل صاحب نے کتابت دیکھی، اس کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور بار بار وجد کی سی کیفیت طاری کرتے رہے کہ واقعی موتی پروئے ہیں اس کاتب نے کیا نوک پلک ہے اور کیا دائرے ہیں، اور فوراً ہی پریس مین کو آواز دے کر اس کو نہایت تفصیلی لکچر دیا کہ پہلے ان صاحب کو دیکھ لو، یہ میر صرف دوست نہیں بلکہ بھائی بھی ہیں محسن بھی ہیں، مربی بھی ہیں اور زندگی میں آج یہ پہلی سعادت مجھ کو حاصل ہوئی ہے کہ میں بھی ان کے کسی کام تو آ سکوں، لہٰذا یہ کاپیاں آپ لے جائیں اور ان سب کو جموا دیں تا کہ کل ہی میں بھائی صاحب کو پروف اٹھوا کر دے دوں۔ پریس مین نے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی مگر وصل صاحب نے اس کو ڈانٹ دیا کہ جی نہیں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہے۔ سب کام روک کر یہ کام مقدم سمجھا جائے میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ پریس مین کو رخصت کر کے ان صاحب کو بھی دوسرے دن تشریف لانے کے لئے کہہ کر رخصت کر دیا۔

ان صاحب کے جاتے ہی وصلؔ صاحب کے برادرِ عزیز مرتضٰی صاحب نہایت آگ بگولہ تشریف لائے کہ ’’بھائی صاحب آپ کا بھی جواب نہیں۔ مجھ کو بھیجا کہ جا ک رووٹروں کی لسٹ کا کام لاؤں اور یہاں سارے پتھروں پر آپ دیوان کی کاپیاں جموائے بیٹھے ہیں اب اس لسٹ کی کاپیاں میں اپنے سر پر جمواؤں۔‘‘

وصلؔ صاحب کو بھی اب اس نازک صورتِ حال کا اندازہ ہوا کچھ سر ہلایا۔ کچھ داڑھی کھجائی اور اس کے بعد پریس مین کو آواز دے کر حکم دیا کہ وہ سب پتھر کاٹ دئے جائیں۔‘‘

وہ زمانہ آفسٹ کا تو تھا نہیں کہ کتابت محفوظ رہ سکتی زیادہ سے زیادہ چروے اٹھوائے جا تھے مگر وصلؔ صاحب نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی اور اس ساری کتابت اور اس کے سلسلہ کی ساری محنت پر اپنے ایک ہی حکم پر پانی پھیر دیا۔ سارے پتھر کاٹ دئے گئے اور ووٹروں کی لسٹ کا کام شروع کر دیا گیا۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر جب وہ دوست آئے تو ددیکھا کہ وصلؔ صاحب ایک کرسی پر سرد آہوں میں لپٹے اور آنسوؤں میں ڈوبے بیٹھے ہیں۔ سلام کے جواب میں ایک ایسا ’’وعلیکم السّلام‘‘ کہا کہ ان کو پورا یقین ہو گیا کہ ان کے یہاں کوئی موت واقع ہو گئی ہے۔ ان صاحب نے بڑی دیر تک ہمت کرنے کے بعد آخر دریافت کیا کہ ’’خیریت تو ہے۔‘‘

اس کے جواب میں وصلؔ صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے کا وران سے کہا۔ ’’میر بھائی میں نے آج تک آپ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی ہے، کوئی برادرانہ ضد نہیں ہے مگر آج ایک ضد کر رہا ہوں کہ آپ اپنا یہ جوتا اتار لیں اور میرے اس پھٹکار زدہ منہ پر مارنا شروع کر دیں۔‘‘

ان صاحب نے سخت حیران ہو کر کہا۔ ’’وصلؔ صاحب! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔‘‘

وصلؔ صاحب اب بھڑک اٹھے تھے۔ ’’میں جو کچھ کہہ رہا ہوں‘ بخدا ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا میں اسی قابل ہوں میرے پریس والوں نے مجھے اسی قابل کر دیا ہے۔ ہائے کس محنت سے آپ نے کتابت کروائی۔ کتنا وقت اور کتنا روپیہ صرف کیا، غریب الوطن بن کر کتابت کراتے رہے ار وان کم بختوں اس ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ سارے پتھر کاٹ دئے۔ چربہ تک نہ اٹھوایا۔ ماریئے جوتے۔ جوتے ماریئے ورنہ لیجئے۔‘‘

اور یہ کہہ کر خود اپنے ہی جوتے اپنے دونوں ہاتھوں میں پہن کر اب جو اپنے منہ پر مارنا شروع کئے ہیں تو سارا چہرہ لہولہان کر لیا۔ کسی طرح قابو ہی میں نہ آتے تھے۔ وہ صاحب ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ اس کتابت اور دیوان کی طباعت دونوں سے باز آنے کا اعلان کر رہے ہیں وصلؔ صاحب ہے کہ مجنونانہ بن انداز میں اپنا منہ جوتوں سے پیٹتے ہی جا رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہ

طوفان تھما تو وہ صاحب موقع غنیمت جان کر چپکے سے کھسک لئے اور جب وصلؔ صاحب کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ وہ جا چکے ہیں تو لوٹے میں پانی طلب کر کے ہاتھ منہ دھو کر نہایت اطمینان سے بیٹھ کر حقہ پینے لگے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔

رائے بریلی کا مشاعرہ اس وقت ختم ہوا جب ٹرین کا وقت بہت تنگ تھا بھاگم بھاگ ہم لوگ اسٹیشن تک پہنچے ہی تھے کہ ٹرین نے روانگی کے لئے رینگنا شروع کر دیا۔ اب اتنا وقت کہاں تھا کہ ٹکٹ لیتے۔ تار پھاند کر جو ڈبہ سامنے آیا اسی میں سب بھرّ امار کر گھس گئے مگر سب کے بعد اس ڈبہ میں داخل ہونے والا ٹکٹ چیکر تھا جو پہلے تو بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اس کو اپنا فرض یاد آیا ور اس نے ہم لوگوں سے ٹکٹ طلب کئے۔ ہم سب نے وصلؔ صاحب کی طرف اشارہ کیا جو انتظاماً یا واقعی کچھ اونگھ رہے تھے۔ ٹکٹ چیکر نے ان کے آرام میں بھی خلل ڈالا اور ان کا شانہ ہلا کر ٹکٹ طلب کیا۔ وصل صاحب نے آنکھ کھول کر اس کو دیکھا اور مسلسل دیکھتے رہے اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر ایک نہایت شفقت آمیز طمانچہ اقسم کے گال پر مارتے ہوئے کہا:

”بڑا لمبا ہو گیا ہے۔“

اور یہ کہہ کر دوسروں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ اتنا سا تھا اور ایسا نامراد کہ جب میں نے گود میں لیا اس نے میرے نمازی کپڑے غارت کیے اور ان کے باوا جان ان کی اسی ادا پر فریضہ تھے۔ ہیں کہاں وہ بڑے میاں۔“

اس بیچارے نے نہایت سعادتو مندی سے کہا۔ ”ان کا تو تین سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔“

اور اس محبِّ صادق کی وفات کی کی خبر سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر اپنے کو سنبھال کر فرمایا۔ ”انتقال تو وہیں ہوا ہو گا۔“

اس نے کہا۔ ”جی ہاں مرزا پور میں انتقال فرمایا۔“

وصلؔ صاحب نے کہا۔ ”مرزا پور میں یہ حال تھا کہ بیچ میں سڑک اِدھر میرا مکان اُدھر

ان کا، ہر وقت کا ساتھ اٹھنا ساتھ بیٹھنا، اتنے تعلقات مگر کس مردود کو اس کا نام تک یاد رہا ہو بودم کہا کرتا تھا ہمیشہ اور بودم ہی کہتا رہا۔ اپنی والدہ سے کہنا کہ مقبول چچا ملے تھے وہ بتائیں گی سارے حالات۔ ہاں تو بیٹا تم ہملوگوں سے دام لے لو۔ ٹکٹ تو جلدی میں ہم خرید نہیں سکے۔ چائے تک نہیں پی ہے اس بھاگم بھاگ میں۔“

اس نے مارے سعادت مندی کے نہ صرف یہ کہ ٹکٹ نہیں بنائے بلکہ لکھنؤ پہنچ کر اس وقت تک پلیٹ فارم کے باہر جانے نہیں دیا جب تک سب کو چائے نہیں پلا دی۔

ایک واقعہ اور جس کے بغیر وصلؔ صاحب کی شخصیت تشنہ رہ جائے گی۔ ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے ہم چند احباب ٹرین کے انتظار میں کانپور کے اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے کہ چند انگریز ڈریس سوٹ میں ملبوس ایک نوخیز حسینہ کے ساتھ آئے اور اس لڑکی کو اپنے گھیرے میں لے کر کھڑے وہ گئے۔ معلوم نہں ے کہ کیا سوجھی کہ میں نے وصلؔ صاحب سے کہا کہ ”مولانا! آپ کے لئے کوئی بات ناممکن تو ہے نہیں مگر کیا آ اس لڑکی کی پیشانی چوم تے ہیں۔“

وصلؔ صاحب نے اس امکان پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے داڑھی کھجائی۔ وہ غور و فکر کے لئے داڑھی سے مشورہ ضرور لیتے تھے۔ میں نے اور دوسرے احباب نے ان کو سنجیدہ دیکھ کر کہا کہ ”خدا کے لئے یہ غضب بھی نہ کیجئے گا۔ ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں مگر وصلؔ صاحب نے کہا:

”تم میرا امتحان لیتے ہو تو میں یہ امتحان ضرور دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ اُدھر روانہ ہوئے اور ہم لوگ مخالف سمت ان سے غیر متعلق بن کر چل دئے اور دور سے جا کر دیکھا کہ وصلؔ صاحب نے دو انگریزوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر وہ دائرہ توڑا اور اس لڑکی کے قریب جا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی کو اس طرح چوما ہے کہ وہ چیخ پڑی مگر اس سے زیادہ زور سے وصلؔ صاحب نے داڑھی ماری کہ:

”ہائے بالکل میری زہرہ ہے۔ میری بچّی۔ وہی ناک وہی نقشہ۔ وہی قد وہی قامت۔“

اس عرصہ میں وہاں ایک بھیڑ لگ چکی تھی اور اب ہم لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وصلؔ صاحب ایک انگریز کو سمجھا رہے تھے کہ ابھی چند دن ہوئے میری بچی مر چکی ہے۔ وہ اس بچی سے اس قدر مشابہ تھی کہ اس وقت میں اس بچی کی شکل میں اسی کو دیکھ رہا ہوں۔ عالم یہ تھا کہ کوئی وصلؔ صاحب کو رومال کی ہوا دے رہا تھا، کوئی ان کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا اور وہ لڑکی نہایت شکستہ اردو میں ان کو سمجھا رہی تھی کہ ”ہم تمھارا بیٹی ہے۔ ہم تمھارا جاورا (زہرہ) ہے۔“ وصلؔ صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

یہ عجیب وغریب شخصیت اور انجام ایسا بخیر کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا دامن تھامتے ہی وصل کچھ کے کچھ ہو گئے آخر کار اسی دامن کے زیر سایہ تھانہ جون ہی میں آخری سانس لی اور دنیا کو حیران چھوڑ گئے کہ وصلؔ اس طرح واصل بجق ہوتے ہیں۔

* * *

۴

وصلؔ صاحب کا ذکر ختم ہو تو کسی اور کا بھی ذکر شروع کیا جائے مگر یہ ذکر نہ اتنا مختصر ہے کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے، نہ اتنا محدود کہ اس میں کسی اور کے ذکر کی گنجائش ہی نہ نکلے۔ میں تو جس کسی کا ذکر چھیڑنا چاہتا ہوں، وصل صاحب کو اس ذکر میں موجود پاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ گورکھپور سے لکھنؤ آ جانے کے بعد وصل صاحب ایک انسان نہیں بلکہ ایک انجمن بن کر رہ گئے تھے اور لکھنؤ کے تمام شعری وادبی حلقہ کی ٹھیکیداری اس حد تک ان کے حصے میں آ گئی تھی کہ لکھنؤ کی ادبی محفلیں تو درکنار لکھنؤ سے باہر بھی اگر کوئی مشاعرہ ہوتا تھا تو بانیانِ مشاعرہ رلکھنؤ کے شعراء کو مدعو کرنے۔ فرداً فرداً ہر شاعر کے گھر پر جانے بجائیے سیدھے وصل صاحب کی خدمت میں پہنچتے تھے اور وصل صاحب ہی سب کی طرف سے وعدہ کر کے بانیانِ مشاعرہ کی طرف سے آنریزی میز بان بن جایا کرتے تھے اور اب یہ ان کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ لکھنؤ کے شعراء کو دعوت نامہ پہنچائیں۔ ان کو مشاعرے کی شرکت کے لئے راضی کریں اور وہ اگر شرافت کے ساتھ راضی نہ ہوں تو ڈرا کر، دھمکا کر، ڈانٹ کر، ڈپٹ کر بہرحال کسی طرح راضی کریں اور اپنی قیادت میں ان کا قافلہ لے کر روانہ ہوں۔ راستہ میں وہ ہر شاعر سے فرداً فرداً اس کی طرحی غزل سنتے تھے۔ کسی سے کہتے تھے کہ ”اپنا ساتواں شعر کاٹ دیجیے۔“ کسی کو نویں شعر پڑھنے کا ممانعت ہوتی تھی تو کسی کو گیارہویں شعر کے نہ پڑھنے کی تاکید کی جاتی تھی اور اگر اس کی وجہ پوچھی جائے تو نہایت سادہ سا جواب دیا جاتا تھا کہ ”یہ میں پڑھوں گا“ حالانکہ خود ان کے پڑھنے کے لئے ایک نہیں کئی غزلیں ان کے جیب یں ہوتی تھیں جن کے متعلق کچھ کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے آئیں۔ بس یہی سمجھ کر رہ

جانا پڑتا تھا کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

مشاعرے سے کچھ دیر پہلے وصل صاحب ان سینکڑوں اشعار میں سے اپنے لئے ایک تیرہ شعر کی غزل تیار کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ عطر مجموعہ کے قسم کی ہوتی تھی اور حاصلِ مشاعرہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی تھی۔ اور یہ بات ہے کہ وصل صاحب اس کو پڑھ کر غارت کر دیں۔ اس لئے کہ وہ غزل پڑھتے نہیں ے بلکہ ''غزل ڈانٹتے'' تھے۔ چہرا سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا اور وہ زانوں پیٹ پیٹ کر اس طررح ایک ایک شعر پڑھتے تھے۔ گویا اس شعر کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے ہیں اور طے کر چکے ہیں کہ آج یہ شعر نہیں یا میں نہیں۔ ان کی شعر خوانی کا اندازہ ہسٹیریا کے دورے سے بہت ملتا جلتا تھا مگر کچھ دن کے بعد ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی اچھی سے اچھی غزل ان اس خونخوار شعر خوانی سے ذبح ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے خود پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ہر مشاعرے کے لئے کسی نہ کسی خوش آواز شاعر کو پہلے سے طے کر لیا کرتے تھے کہ وہی ان کی غزل پڑھے گا اور وہ صرف داد کی رسید کے طور پر سلام کریں گے۔

وصلؔ صاحب جب سے شاعروں کے تھوک فروش تاجر یا ٹھیکیدار بنے تھے انھیں کے درِ دولت پر ہر چھوٹے بڑے شاعر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی کہ آج ان کے یہاں حضرت ریاضؔ خیر آبادی ٹھرے ہوئے ہس ے تو کل حضرت جگرؔ مراد آبادی ان یہاں سے نکل بھاگ نے کے لئے پھڑ پھڑا رہے ہیں مگر راہِ فرار نہس ے ملتی۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے حضرت جوشؔ ملیح آبادی ان کی حراست میں آئے ہوئے ہیں۔ ہر چند کے جوشؔ صاحب سے رفیع احمد مرحوم کے ساتھ بارہا ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور یہ ملاقاتیں تکلف کے حدود کو کب کا ختم کر چکی تھیں مگر وصلؔ صاحب کے شکنجہ میں ان کی بے بسی کا جو تماشہ نظر سے گذرا وہ پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ وصلؔ صاحب ن کو کانپور کے ایک مشاعرے میں لے جانے کے لئے پکڑ لائے تھے اور جوشؔ صاحب ان سے

رحم کی اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ کسی طرح ان کو بخش دیں۔ منت سماجت سے کام نہ چلا تو جوشؔ صاحب نے ''پٹھنوری'' دکھانے کی کوشش کی کہ ''نہیں صاحب اس مشاعرے کی شرکت کے لئے آمادگی کی ایک رمق بھی میں اپنے میں نہیں پاتا یہ بالجبر اغوا ہے۔''

وصلؔ صاحب نے کڑک کر پوچھا: ''کیا کہا؟'' اور فوراً اپنے مثنوی دانتوں کی پلیٹیں مبان سے ٹھیل کر منہ سے باہر نکال دیں اور اب جو یہ نقلی دانت بجائے ہیں تو جوشؔ صاحب نے ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا:

''اُف، اُف، جاؤں گا صاحب یقیناً جاؤں گا۔ فُوّہ جاؤں گا اور جہاں وصلؔ صاحب نے اپنے یہ دانت ضبط کئے جوشؔ صاحب نے پھر رسیاں تڑانا شروع کر دیں مگر توبہ کیجئے ان باتوں سے کہیں ان کو وصلؔ صاحب سے رہائی حاصل ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کانپور جانے والی ٹرین میں وصلؔ صاحب اور جوشؔ صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے مگر اب بھی وصلؔ صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے دانت باہر نکال کر بجاتے تھے اور جوشؔ صاحب جھرجھری لے کر اور ''اُف'' کہہ آنکھیں بند کر لیتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد وصلؔ صاحب سے کچھ کہتے تھے جسے وصلؔ صاحب لکھ لیتے تھے پھر جوشؔ صاحب پہلو بدل کر کہتے تھے کہ ''بس صاحب بس'' اور وصلؔ صاحب کو پھر دانت نکال کر بجانا پڑتے تھے۔ کانپور تک یہی سلسلہ قائم رہا اور کانپور کے اسٹیشن پر جب جوشؔ صاحب ٹرین سے اترے ہیں تو سخت پسپاں نظر آ رہے تھے گویا راستہ بھر ان سے چکّی پسوائی گئی ہو۔ مشاعرہ تو خیر بخیر و خوبی ختم ہو گیا لیکن صبح ہوتے ہی جوشؔ صاحب تمام یحباب کو گھیر کر دریا کی سیر کو لے گئے اور گنگا گھاٹ پر پہنچ کر کشتی کی سیر کے لئے مچل گئے۔ آخر ایک کشتی کرایہ پر لی گئی اور اس میں ہم سب بیٹھ کر اس پار سے اس پار جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ گنگا ان دنوں باڑھ پر تھی۔ نہایت خوفناک بھنور پڑ رہے تھے اور ملاح کا دل ہی جانتا ہو گا کہ وہ دھارے کو کاٹ کر کس طرح لشتی کو لے جا رہا تھا کہ عین بیچ دھارے میں پہنچ کر جوشؔ صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کے ایک دم کشتی میں کھڑے ہو گئے اور پہلے تو ایک مختصر سی مگر

نہایت ولولہ انگیز تقریر کی جس کے ممدوح وصلؔ صاحب تھے کہ اس شخص نے کل سے آج تک مجھ پر نہایت انسانیت سوز مظالم کیے ہیں اور مجھ کو زندگی سے اس حد تک بیزار کر دیا ہے کہ اب میں خود کشی کی جرأت آزمابُز دلی کے لئے آمادہ ہو چکا ہوں اور یہ کہہ کر انھوں نے کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے کنارے پر دوسرا پیر رکھ کر ایک پوربی گیت چھیڑ دیا کہ:

اب نہ لکھو سیاں چھٹیاں گوں کی --- اب نہ لکھو
چھٹیاں پڑت ہورے انسوا بہت ہیں
انسوا بہت جیسے ندیاں سون کی
اب نہ لکھو سیاں چھٹیاں گوں کی --- اب نہ لکھو

وہ شوق سے گاتے کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر انھوں نے ساتھ ہی ساتھ رقص بھی شروع کر دیا جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ناؤ ڈگمگانے لگی اور ملاح نے چیخ کر کہا ڈوب جائے گی ناؤ، صاحب یہ نہ کرو۔ مگر مگر جوشؔ صاحب کا جواب یہی تھا کہ ہم ڈبونے ہی کے لئے یہ کر رہے ہیں ارو پھر جو اپنے دونوں پیروں کو جنبش دی ہے تو ہم سب کو موت کا ایک ایسا جھونکا آیا ہے کہ ہر زبان پ رکلمۂ شہادت تھا۔ مولانا آسیؔ نے سنجیدگی سے بُرا مان کر کہا:

’’بیٹھ جایئے جوشؔ صاحب یہ نہایت مہلک مذاق ہے۔‘‘

جوشؔ صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ’’غالبؔ کا شارہ اور سنجیدگی کو مذاق کہہ رہا ہے۔‘‘

مولانا آسیؔ کی شرح دیوانِ غالبؔ اسی زمانہ میں نکلی تھی۔ نشتر سندیلوی نے گھبرا کر کہا۔ ’’یہ کیا بیہدگی ہے؟‘‘

اور جوشؔ صاحب نے بڑے رُعبِ سلطانی کے ساتھ کہا۔ ’’یہ کس گستاخ کی آواز ہے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ وہ میرے قدموں پر جھک جائے ورنہ یہ لو۔‘‘

اور اب جو ایک ہچکولہ کشتی کو دیتے ہیں تو نشتر سندیلوی ’’خدا کے لئے جوش بس کرو‘‘ کہتے ہوئے واقعی ان کے قدموں پر جھکے ہوئے تھے۔ اب وصلؔ کی باری تھی وہ صرف اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ’’میں کہتا ہوں جوشؔ صاحب۔‘‘

کہ جوش صاحب نے کڑک کر کہا۔ ’’خاموش! خبردار جو ایک لفظ بھی زبان سیک نکالا۔‘‘ نکالو اپنے دانت۔ بالکل نکالو۔ اپنی ہتھیلی پر درندے کے اس مصنوعی جبڑے کو رکھ لو۔ کرو ان کو دریا بُرد۔ ان ملتجی نظروں سے دیکھ رہے ہو تو ان دانتوں کو صرف گنگا اشنان کراؤ۔ اب رکھ لو ان کو جیب میں۔‘‘

اور وصلؔ صاحب ان کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرتے رہے اس کے بعد جوشؔ صاحب دوسروں کی طرف مخاطب ہوئے۔ ’’اے موت سے ڈرنے والے بُزدل شوکت تھانوی، اپنی ناک سے کشتی کے تختہ پر دستخط کر۔‘‘

میں ایک طرف سہا ہوا تھا اور واقعی ختکاجِ قلب میں مبتلا تھا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آرہے تھے کہ جب اس غرقابی کی خبر گھر پہنچے گی تو گھر میں کیسا کہرام مچے گا۔ میری دکھیاری ماں کیسی پچھاڑیں کھائے گی۔ اس غم کے پہاڑ کو میرا بوڑھا باپ کیوں کر برداشت کرے گا۔ میری چاہنے والی بہن اپنا کیا حال کرے گی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جان بخشی کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ کشتی کے تختہ پر ناک سے لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ امین سلونوی جو غالباً میرے ہوئے بیٹھے تھے اپنی مونچھوں کا سارا تاؤ بھول چکے تھے ارو اس دنیائے فانی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ اپنا نام سن کر چونکے۔ جوش صاحب نے ان کو للکار کر کہا:

اور جب ان کے منہ سہے وئی آواز نہ نکل سکی تو جوشؔ صاحب نے کشتی کو ایک مرتبہ ڈگمگا کر نادری حکم دیا کہ:

’’بیان کرو اپنا شجرہ۔‘‘

ارو امین سلونوی نے اس رقت اور اس عاجزی سے ’’یاد نہں ے آتا جوشؔ صاحب۔‘‘ کہا ہے کہ جوشؔ صاحب کی ساری اداکاری ختم ہوگئی ارو وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ بات یہ تھوڑی ہی دے رکی تھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب پر مصیبتوں اور آزمائشوں کی صدیاں بیت گئی

ہیں۔ گنگا کی خفناک طغیانی کیفیت ملاح تک کا بار بار یہ کہنا کہ بس اب ڈوبتی ہے ناؤ مگر اسکے باوجود جوشؔ صاحب کا یہ ہولناک کھیل ایسا نہیں تھا جس نے کسی کے حواس بجا رکھے ہوں۔ یوں تو سبھی اپنی چوکڑی بھول چکے تھے مگر مجھے تو سب سے زیادہ اپنی ہی کیفیت کا علم ہے کہ میں تو یہ سمجھ چکا تھا کہ اس مشاعرے میں ہماری موت ہم کو کھینچ لائی تھی اور یہ حضرت ملک الموت ہیں جن کو اب تک جوشؔ ملیح آبادی سمجھتے رہے ہیں۔ کشتی سے اترنے کے بعد بھی دیر تک ہوش بجا نہ ہو سکے اور یہ یقین مشکوک سا محسوس سا ہوتا رہا کہ اس گردابِ بلا سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو ایک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد سب سے پہلا ''لاحول'' مولانا عبدالباری آسیؔ نے بھیجا اور ان کی تائید نشتر سندیلوی نے کی کہ ''حد کر دی بخدا۔'' اور اب مولانا آسیؔ ابل پڑے کہ ''میں نہ اس قسم کے مذاق کا عادی ہوں نہ اس قسم کے مذاق کو پسند کرتا ہوں اور یہ سارا کیا دھرا وصلؔ صاحب آپ کا ہے۔ میں اس پروگرام میں شرکت ہی نہ کرنا چاہتا تھا مگر آپ کی احمقانہ ضد نے مجھ کو حماقت میں مبتلا کیا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان آخر فاصلہ ہی کتنا رہ گیا تھا۔''

''یہ سوجھی کیا تھی آخر؟''

جوشؔ صاحب نے بڑے مفکرانہ انداز میں جواب دیا:

''اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے عفو و درگزر کا نتیجہ ہے۔ احسان فراموش اقوام نے اپنے محسنوں کے ترحم کا ہمیشہ اسی طرح صلہ دیا ہے جیسا اس وقت مجھ کو دیا جا رہا ہے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔''

نشتر سندیلوی نے تو اس کے جواب میں کچھ تلخ باتیں کہیں مگر مولانا آسیؔ تو اس حد تک ناراض ہو چکے تھے کہ نہ صرف اس وقت انھوں نے اس بحث میں کوئی حصہ لینا چاہا بلکہ اس دن دوپہر کے کھانے میں جب جوشؔ صاحب نے ان کی طرف مرغ کا ڈونگہ بڑھایا ہے تو انھوں نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے جوشؔ صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خیر خیر۔'' اور مرغ تک ان کے ہاتھ سے لینا گوارہ نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا آسیؔ اس واقعہ کو مرتے مرتے نہ

بھولے تھے اور کئی مرتبہ نہایت ناگواری کے ساتھ اس واقعہ کو دہرا چکے تھے بلکہ بعض اوقات تو یہ واقعہ ان کے ذہن میں ایسا بے محل تازہ ہوتا تھا کہ مولانا آسیؔ کی اس یاداشت پر غصہ آنے لگتا ہے۔ مثلاً جوشؔ صاحب کی ایک نظم ''فتنۂ خانقاہ'' کسی رسالہ میں دیکھ کر میں پھڑک اٹھا اور وہ نظم جھ کو اس قدر پسند آئی کہ جو کوئی بھی مجھ کو ملتا تھا۔ اس کو میں اس نظم کا ایک آدھ بند سناتا ضرور تھا۔ چنانچہ مولانا آسیؔ کو بھی میں نے اس نظم کے کچھ حصے سنائے۔ مولانا بڑے غور سے نظم سنتے اور جھومتے رہے ارو جب نظم سن چکے تو کہنے لگے:

'ہاں صاحب، بہت بڑا افنکار ہے یہ شخص۔ الفاظ کا ایسا جادوگر بڑی مشکل سے پیدا ہوگا مگر وہ یاد ہے آپ کو کانپور والا واقعہ۔ زندگی ہی تھی جناب، جو ہم لوگ بچ گئے۔ اس دن میرے خیال میں وہ کوئی مراق کا دورہ اٹھا تھا جوشؔ صاحب کو۔''

میں نے جل کر کہا کہ چھوڑیے مولانا اس قصہ کو۔ دیکھیے تو سہی کیا کہتا ہے ظالم کہ ؎

ہاتھ اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے
دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

مولانا نے بڑی فراخ دلی سے داد دی مگر داد دیتے دیتے پھر ایک دم سے کہنے لگے۔ ''میں حیران ہوں کہ اس دن جوشؔ کو ہوا کیا تھا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ کیسی بے کسی کی موت مرتے ہم سب۔'' عرض تو کیا کہ مولانا آسیؔ مرتے دم تک اس نہ ہو والے حادثہ کانپور کو نہ بھولے تھے۔ مگر اس حادثہ کے سلسلہ میں ایک صدمہ جوشؔ صاحب کو بھی تھا کہ ''ہائے آج رفیع احمد خاں نہ ہوا۔ زندگی بھر کے بدلے آج چکا لیتا۔'' اللہ جانے رفیع احمد خاں ہوتے تو اس موقع پر کیا کرتے

جوشؔ صاحب کا یہ جذبۂ انتقام بھی غلط نہ تھا۔ اس لئے کہ یہ واقعہ ہے کہ رفیع احمد خاں نے جوشؔ صاحب کے ساتھ بعض ایسے سلوک کیے تھے کہ ان کا بدلہ لینے کے لئے جوشؔ ترستے ہی رہ گئے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ جس کا میں خود عینی گواہ ہوں۔ اس حقیقت پر تھوڑی بہت روشنی تو ڈال ہی دے گا۔ دیوہ شریف میں حاجی وارث علی شاہ کا عرس تھا۔ عرس کے موقع پر دیوہ شریف میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے جوشؔ صاحب رفیع احمد خاں مرحوم اور میں غالباً کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے۔ دیوہ شریف پہنچے وہاں سماع خانہ میں بیدمؔ شاہ صاحب وارثی کی نظر جوشؔ صاحب پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ جوش جوش۔ جوش کا ایک شور برپا ہو گیا اور جوش صاحب ہاتھوں ہاتھ اس بے پناہ ہجوم سے اٹھا کر کر بیدم شاہ صاحب کے پاس پہنچا دیے گئے اور ہم لوگس وکوسی نے پوچھا بھی نہیں۔ رفیع احمد خاں مرحوم کو تو کسی اور پر نہیں البتہ جوش صاحب پر بے حد غصہ تھا کہ یہ حضرت بھی ہم لوگوں کو بھول گئے۔ جوش صاحب بڑی دیر کے بعد جب اس میلہ میں اپنے ڈنکے پٹوا کر سماع خانہ سے باہر آئے تو رفیع احمد حاں نے ان سے کچھ نہ کہا۔ اور بڑی محبت سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھومنے لگے کہ ناگاہ ایک دختر نہایت ابوالہول قسم کی دیہاتی عورت جوش صاحب کے قریب سے جو گزری تو رفیع احمد خاں نے اپنے اسی ہاتھ سے جو جوش صاحب کی کمر میں تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ''اُف'' قسم کی عورت کے بازو میں چٹکی لے لی۔ اس عورت نے دیکھا آؤ نا تاؤ جوش صاحب کو وہ دو ہتڑ رسید کیا ہے کہ وہ چونک پڑے اور اب لگی وہ بنکارنے۔ جوش صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا وہ کس طرح اپنے کو بچا کر وہاں سے نکلے ہیں۔ رفیع احمد خاں نے یہ انتقام لینے کے بعد صرف اتنا کہا کہ بڑی عزت افمائیاں ہو رہی تھیں۔ جناب کی سماع خانہ میں اور ہم نیازمندانِ قدیم نیچے دھکے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہم عالی مرتبت کو یاد نہ آئے۔ اب جو اس پہلوان عورت نے ایک ہی ہاتھ دکھایا ہے تو ہماری آڑ لے رہے ہو۔ جاتے کیوں نہیں اپنے بیدمؔ شاہ وارثی کے پاس۔'' جوش صاحب سمجھ چکے تھے کہ یہ ایک پٹھان نے ایک دوسرے پٹھان سے بدلہ لیا ہے۔ لہٰذا کہتے تو کیا کہتے۔ صرف یہی شکر ادا کرتے رہے کہ جس میلہ

میں ابھی جوش کے آنے کی دھوم تھی۔ اس میں شکر ہے جوش کی اس عزت افزائی کے چرچے نہیں ہوئے سچ تو یہ ہے کہ جوش کی بھڑکتی ہوئی جوڑ اگر تھا تو رفیع احمد خاں ہی تھا۔ جس کے تذکرے میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے اور واقعات سامنے آئیں گے۔ ابھی تو اس یگانہ روزگار کا ذکر ہی نہیں چھڑا۔

☞

۵

ادھر یہ بے فکریاں جاری تھیں اُدھر شاعرہ بازیاں ہو رہی تھیں۔ احباب نوازیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جوانی کی راتیں تھیں امنگوں کے دو اور سمجھے یہ بیٹھے تھے کہ زندگی بے نکیل کے اونٹ کا نام ہے ارو ادھر قدرت ہنس رہی تھ یکہ برخوردار ایسے شکنجے مس ے کسے جاؤ گے کہ یہ ساری چوکڑیاں بھول جاؤ ارو چھٹی کا دودھ زبان پر آ جائے۔ والد محترم جن کے دم سے یہ ساری بے فکریاں تھیں۔ اروان کی بیماری نے ان ساری بے فکریوں کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ ان کی تیمارداری نے شعر و شاعری اور دوست و احباب سب کو یکسر بھلا دیا تھا۔ ان کی خدم تکرنے والے اور بھی موجود تھے، مگر میں اس معاملہ میں بے حد خود غرض بنا ہوا تھا۔ اور میرا جی چاہتا تھا کہ یہ سعادت سوائے میرے کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ مجھ کو وہ وقت کبھی نہ بھولے گا۔ جب ایک شب کوئی دو بجے ہوں گے۔ میں ولد محترم کا ''بڈ پین'' صاف کرنے جا رہا تھا۔ انھوں نے وگلدہ محترمہ سے کہا کہ ''تم اسی کی طرف سے متفکر رہتی تپی نا کہ یہ نہایت غیر ذمہ دار اور بے فکرا ہے۔ اب دیکھ لو کہ یہ میرا کیسا ذمہ دجر تیماردار بنا ہوا ہے۔ وقت انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔'' مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آ رہا ہے جو مجھ کو بہت کچھ سکھائیگا۔ آخرکار وہ نحس وقت بھی آ گیا کہ میرے سر سے میرے چاہنے والے باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور مجھ کو یکا یک محسوس ہوا کہ میرے سر پر نہ آسمان ہے اور نہ پیروں تلے زمین اور ذمہ داریوں کوہ گراں ہے جو جھ پر یکا یک ٹوٹ پڑا ہے۔ میر سامنے اب صرف ایک سوال تھا کہ ''اب کیا ہوگا؟'' والد محترم نے بڑے نازک حالات چھوڑے تھے اور اب ان نازک حالات سے مجھ کو عہدہ برا ہونا تھا۔ ذہم دوڑاتے دوڑاتے خان بہادر سیّد احمد حسین

رضوی ایم۔ ای۔ بی کا خیال آیا۔ تمباکو کے مشہور کارخانہ احمد حسین دلدار حسین کے مالک جو علاوہ آنریری مجسٹریٹ وغیرہ ہونے کے، لکھنؤ کے مشہور روزنامہ ''ہمدم'' کے مشہور ڈائرکٹر بھی تھے۔ صحافت کو اپنے قریب ترین دیکھ کر میں ہمدم کو اپنے عملہ میں شرکت کرنے خواہش لے کر خان بہادر کے پاس پہنچا۔ خان بہادر صاحب کچھ ننہالی عزیز ہوتے تھے اور مجھ سے بری حد تک واقف بھی۔ میری اس خواہش کو سن کر انھس ونے مجھ سے صرف ایک ہی بات کہی کہ ''میاں بڑی مشکل پسندی سے کام لے رہے ہو۔ اخبار نویسی بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ مگر میں تمھاری حوصلہ شکنی نہیں کرتا البتہ ہمدم میں جو جگہ دے سکتا ہوں وہ حاضر ہے۔ اب ترقیاں کرنا تمھارا کام ہے۔'' اور یہ کہہ کر سیّد جالبؔ دہلوی کے نام ایک خط لکھ دیا جو روزنامہ ہمدمؔ کے ایڈیٹر تھے۔ میں وہ خط لے کر ہمدم کے دفتر پہنچا اور سیّد جالبؔ کے کمرے میں جا کر دم لیا۔

تُرکی ٹوپی پہنے جس کا پھُندنا آگے پڑا ہوا تھا اور پھندنے کے نیچے سفید بالوں کا گچھّا ٹوپی سے پناہ مانگ کر نکلا بھاگتا تھا۔ پریشان سی سفید داڑھی۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں قلم، میز سے کچھ ہی اٹھا ہوا سر۔ اس سج دھج سے ایک بزرگ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے گویا اونگھ رہے ہیں۔ میر آنے کا نوٹس ہی نہں ے لیا۔ لکھتے رہے۔ برابر لکھتے رہے۔ نہ کچھ سوچنا نہ غور کرنا۔ بس لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً کاتب کے آ جانے سے گردن اوپر اٹھی، موقع دیکھ میں نے عرض کیا۔ ''السّلام علیکم'' نہایر کرخت آواز میں جواب میں ''وعلیکم السّلام'' کہا۔ میں نے خان بہادر صاحب کا خط چپکے سے دے دیا۔ پڑھ کر دزدیدہ نگاہوں سے پہلے تو دیکھا۔ اس کے بعد میرا شجرہ شروع کر دیا۔

''آپ کے چچا صاحب قبلہ نے دہلی سے روزانہ اخبار نکالا تھا۔ میں اس میں کام کر چکا ہوں۔ بلکہ وہ میرے ایک قسم کے استاد ہیں وہ آپ کے بڑے چچا لندن تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے پھر آپ تشریف ہی نہ لائے۔ آپ کے والد صاحب بھوپال میں تھے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میں حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کو میرے ہی متعلق نہیں ہر ایک کے متعلق عام طور پر معلوم ہوا کرتا تھا کہ وہ کون ہے کیا ہے۔ اس کا خاندان کہاں سے متعلق ہے۔ اس کے دادی کے کتنی مرتبہ آپریشن ہوئے تھے۔ اس کی نانی کی موت کس مرض میں واقع ہوئی اور اس کے خالو کو کس جرم میں دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ یہ مقدمہ کن کن عدالتوں میں رہا کس کس وکیل نے کیا کیا جرہ کی وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں ہم آپ سب سنا کرتے تھے مگر یاد نہیں رکھتے۔ میر صاحب کے دماغ میں بلکہ کان میں ایک مرتبہ کوئی بات پڑ جائے۔ پھر کیا مجال کہ اسے بھول جائیں وہ بات دماغ سے نکلنے کے لئے پھڑ پھڑائے گی مگر میر صاحب کا دماغ یاداشت کا ایسا پنجڑہ تھا جس میں کوئی صید ایک مرتبہ آکر پھر کبھی رہا نہیں ہوا۔

مختصر یہ کہ ہمدم میں ملازم ہو گیا۔ میر صاحب نے رگیدنا شروع کر دیا۔ میرے سیاہ حرف کی عبارت پر ان کے سرخ رنگ کی اصلاح ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو سیاہ عبارت تمام کی تمام قلم زد ہو جاتی تھی اور اس کی جگہ پر میر صاحب کی سرخ عبارت میری نالائقی پر خون کے آنسو بہاتی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد سرخ سیاہ عبارت کا تناسب ایسا ہو گیا کہ قتلِ عام تو ہوا تھا مگر کچھ سخت جان بچ گئے ہیں غالباً سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ رفتہ رفتہ خون کی ایک آدھ چھینٹ اور پھر خال خال سرخ رنگ کی چمک مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز اصلاح کے بغیر رہ گئی ہو۔ ترجمہ ہو، مزاحیہ کالم ہو۔ ہر جگہ اصلاح موجود ہے۔ اکثر تو اصلاح پر غصہ بھی آتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ ہمت کر کے لڑ بیٹھا۔ میں نے لکھا تھا ایک جگہ ’’نقطۂ نگاہ‘‘ آپ نے اس کو کاٹ لکھ دیا ’’زاویۂ نگاہ‘‘ جلبلاتا ہوا وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچا۔

’’آپ نے ’’نقطۂ نگاہ‘‘ کاٹ کر ’’زاویۂ نگاہ‘‘ بنا دیا ہے اس میں کیا فرق ہو گیا۔‘‘

سر جھکائے ہوئے بولے۔ ’’بہت بڑا فرق ہے دونوں میں نقطۂ نگاہ تیقّن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور زاویۂ نگاہ میں

شک کا احتمال باقی رہتا ہے گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ دریافت نہیں کیا ہے۔ جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں زاویۂ نگاہ زیادہ سجتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سائمن کمیشن کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبّر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں زاویۂ نگاہ لکھ دیجیے تو آپ پر نتیجہ کی ذمہ داری نہیں رہتی اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ سائمن کمیشن کا مقصد اپنے نتیجہ پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہو اس وقت اگر زاویۂ نگاہ غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے مگر نقطۂ نگاہ کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے۔‘‘ اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی اصلاحوں کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ میر صاحب کو زندہ انسائکلو پیڈیا کہا جاتا تھا۔ آپ لاکھ اجنبی بن کر جائیں مگر جہاں آپ نے اپنا نام بتایا اور والد کا نام سنایا۔ آپ کے متعلق باقی حالات وہ آ کو سنانا شروع کر دیں گے کہ آپ کے دادا اس سنہ میں ہجرت کر کے افغانستان کے راستے پشاور تشریف لائے اتنے دن تک خشک میووں کی تجارت کی اور اس تجارت میں اتنا کمایا۔ پھر خشک میووں کی جتارت پر ایک سیر حاصل تقریر کریں گے۔ میووں کے باغات کو اگر موضوعِ سخن بنا لیا ہے تو سمجھاتے چلے جائیں گے کہ پالیز کس طرح بناتے ہیں اور ان میں کاریزوں کے ذریعے کس طرح پانی پہنچاتے ہیں۔ ان زمین دوز نہروں کے پانی کا مزہ کیسا ہوتا ہے ان کا پانی کس قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور ان امراض کے لئے کون کون سی دوائیں مفید ہیں۔ ان کا کیا علاج ہے۔ اگر آپ نے گھبرا کر ان کی توجہ خاود ان ہی کے حقے کی طرف مبذول کرا دی کہ ’’سیّد صاحب حقہ جل بجھا ہے شاید۔‘‘ تو اب وہ حقے کے موضوع پر ایسی بحث کریں گے کہ حقہ کی تمام تاریخ آپ کے سامنے آ جائے گی کہ کب یہ ایجاد ہوا۔ کن کن ماما لک میں کس کس قسم کا حقہ پیا جاتا ہے۔ عظیم اللہ خانی حقہ کیا چیز ہے۔ پیچوان، گڑگڑی، ناریل، سٹک یہ سب کیا ہیں؟ لکھنؤ نے حقے کے معاملہ میں کن تکلفات سے کام لیا ہے ہر دم تازہ حقے کی کونسی قسم ہے۔ مختصر یہ اگر آپ اسی حقے پر ایک تھیسس لکھ دیں تو ٹاکٹریٹ کہیں نہیں گئی اور ایک حقے پر کیا منحصر ہے۔ کسی موضوع پر بات کر لیجیے انشااللہ بات کریں گے بات کی جڑ

بتائیں گے۔ ارو بات کی پھنگی تک بات کرتے چلے جائیں گے۔ مثلاً چھیڑ دیجیے حلوہ سوہن کا ذکر، بس وہ شروع ہو جائیں گے کہ ''جی ہاں خوب ہوتا ہے حلوہ سوہن۔ مگر دراصل یہ مٹھائی نہیں ہے بلکہ حکماء ننے اُمراء کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں گھی کھلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور تاریخ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حلوہ سوہن سب سے پہلے نانا فرنویس کے لئے ان کے طبیب ہندی عبدالستار سرہندی نے بنایا تھا مگر وے اس کو ترقی نہ دے سکے اور یہ نسخہ صرف بیاض سرہندی میں رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ حکیم الحکماء میر فضل اللہ سبزواری نے اس نسخے کو حاصل کیا اور کئی امراء پر آزمایا اور دماغ کی خشکی اور نیند کی کمی کے لئے یہ بہترین نسخہ ثاتب ہوا۔ پھر اس میں ترمیمیں کی گئیں اور آخری صورت یہ ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح کی ایک چیز بنائی جاتی تھی جس کے سوراخوں میں گھی ہوتا تھا اور اس میں ایسے اجزاء بھی ہوتے تھے کہ یہ گھی نقصان نہ پہنچا سکے اور معدہ اس کو قبول کرے۔ سینہ بہ سینہ یہ نسخہ دلی کے رحمت علی حلوائی تک پہنچا اور اس کے خاندان نے حلوۂ سوہن کو اتنی ترقی دی کہ ملکہ وکٹوریہ اس ہندوستانی تحفے کو کرسمس کا بہترین تحفہ کہا کرتی تھیں۔ عرض تو کیا کہ کیا حقہ کیا حلوۂ سوہن، ان کو تو اپنی معلومات کے اظہار کے لئے ایک موضوع چاہیے ہوتا تھا۔ وہ حقہ نہ سہی حلوہ سوہن سہی۔ حلوہ سوہن نہ سہی اجنتا کے غار سہی۔ جو موضوع چھڑ جائے جالب صاحب اس پر گھنٹوں بول تے تھے۔ خواہ وہ جنگِ بلقان کے متعلق ہو یا سائمن کمیشن سے متعلق۔ وہ زردوزی کا قصہ ہا یا نقب زنی کا۔ ان کو اپنچی معلومات کے خزانے لٹانے سے مطلب۔ افیون سے شوق فرماتے تھے اور اپنی پرانی کتابیں جمع کرنے کے افیون افیون سے زیادہ رسیا تھے۔ دعوتں وکی شرکت عبادت کی طرح فرض سمجھتے تھے اور یہ حق اسٹاف کے کسی ممبر کو کبھی نہ دیتے تھے۔ روزنامہ ہمدم ہی کے زمانے میں بڑے بڑے شاگرد پیدا کیے سیاست والے سید حبیب، چوہدری رحم علی ہاشمی، قاضی محمد حامد حسرت، انیس احمد عباسی اور نہ جانے کون کون، نام تھا بشارت علی مگر مشہور ہوئے جالبؔ دہلوی کے نام سے، یہ نہ پتہ چل سکا کہ جالبؔ صاحب نے اپنے اس تخلص سے بھی کبھی کام لیا یا نہیں۔ بہرحال جالبؔ صاحب ہمدم سے دست بردار ہو کر اپنے ذاتی اخبار روزنامہ ''ہمت'' کے مالک اور مدیر بن گئے مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔

ہمدم میں میرا تقرر چلیس روپیہ ماہوارے مشاعرہ پر ہوا تھا۔ ڈیوٹی رات کی مقرر کی گھی تھی کہ میں ہر موسم اور قسم کے حالت رات کو بارہ بجے چار میل کا فاصلہ سائکل پر طے کر کے دفتر پہنچا کرتا تھا اور صبح آٹھ بجے گھر واپس آیا کرتا تھا اس معمول میں نہ ساون بھادو کی بارشیں کوئی فرق پیدا ہونے دیتی تھیں نے دسمبر جنوری کے جاڑے۔ راستہ میں جا بجا کتوں کے سامنے اپنا جی ثصفائی پیش کرنا پڑتی تھی اور کبھی کبھی ان سے زیادہ پولس والس و کو سمجھانا پڑتا تھا کہ میں امن پسند شہری ہوں اور چوری کرنے نہیں نکلا ہوں۔ بلکہ قلم سے کنواں کھودنے جا رہا ہوں تا کہ اپنے حصے کا پانی پی سکوں۔ ایک رات ایک نہایت کج خلق کتے نے میرا چسٹر کھینچ کر مجھ کو سائکل سے گرا لیا مگر معلوم ہوا کہ ان کو میری ضرورت نہ تھی بلکہ میرے چسٹر کے صرف ایک دامن کی ضرورت تھی جسے وہ نوچ کر لے جا چکا تھا۔ وہ تو کہیے کہ والدن صاحب کے ترکہ میں مجھ کو ایک چسٹر بھی مل گیا تھا وہ کام آگیا ورنہ اس قیامت کی سردی میں بغیر چسٹر مجھ کو یہ سفر طے کرنا پڑتا۔ غالباً یہ میری اسی صبر آزمائی کا نتیجہ تھا کہ جس وقت سید جالبؔ صاحب دہلوی روزنامہ ہمدم کی ادارت میں مستعفی ہو کر جا رہے تھے۔ میری چالیس روپیہ ماہوار سے شروع ہونے والی تنخواہ پونے دو سو تک پہنچ چکی تھی اور یہ اس زمانہ کی تنخواہوں میں نہایت معقول تنخواہ سمجھی جاتی تھی۔ سید صاحب نے اپنی علیحدگی کے بعد خان بہادر سید احمد حسین رضوی کو جو خط لکھا تھا اس میں سفارش بھی کی تھی کہ میں اپنی قائم مقامی کے لئے۔ شوکت کو چارج دیے دیتا ہوں مگر خان بہادر صاحب سے میری دور کی رشتہ داری میری نہایت قریبی حق تلفی بن گئی۔ اوت انھوں نے خویش پردری کے ڈر سے یہی جواب دیا کہ ملک نثر اللہ خاں عزیزؔ سابق ایڈیٹر مدینہ کا تقرر ہو چکا ہے آپ چارج براہِ راست انھیں کو دیں اور پھر مجھ کو سید صاحب کا وہ خط دکھا کر بھی کہہ دیا، کہ تعلقہ دارانِ اودھ کے جھگڑے میں تم کو پھنسانا اور خود اپنے سر خویش پروری کا الزام نہ لینے کے لئے میں نے تمھارا چارج لینا مناسب نہیں سمجھا۔

سید صاحب کی الوداعی پارٹی کے ساتھ ایک گروپ فوٹو لینے کا اہتمام تھا۔ سید صاحب حسب معمول اس تصویر کے لئے بھی شیروانی کا کالر اور پہلا بٹن بند کر کے باقی تمام شیروانای کھلی چھوڑ کر جوتے کی ڈ دوریاں باندھے بغیر جب چلے تو میں نے ان سے کہا کہ:

’’میر صاحب تصویر کے لئے تو بٹن لگا لیجیے شیروانی کے اور جوتے کی ڈوریاں باندھ لیجیے۔‘‘

میر صاحب کے صاحبزادے عشرت صاحب نے بغیر سوچے سمجھے فرمایا۔ ’’حاجتِ مشاطّہ نیست روئے دلآرام را۔‘‘ سید صاحب نے بڑی متانت سے فرمایا۔ ’’شوکت صاحب سن لیا آپ نے میں اپنے صاحبزادے کا دل آرام ہوں۔ تف ہے اس دل آرام پر جو میری شکل کا ہو۔ ہمارے عشرت میاں کے ذہن میں کسی شعر یا کسی مصرع کا محفوظ رہ جانا بے حد خطرناک ہوتا ہے کہ خدا جانے یہ کب اس کو کسی پر دے ماریں۔‘‘

افسوس کہ سید صاحب کی کوئی تصویر میرے پاس محفوظ نہیں ہے ورنہ اس ’’روئے دلآرام‘‘ کی جھلک دکھائی جا سکتی۔

☞

۶

سیّد جالبؔ تو ہمدم سے چلے گئے مگر میرے لئے ایک ایسی مصیبت چھوڑ گئے جو طول کھینچے کھینچے شیطان کی آنت بن گئی۔ مولانا سیمابؔ اکبرآبادی اور سید جالب کے درمیان کچھ ان بن سی ہو گئی تھی اور اس فساد کی جڑ وہ نظمیں تھیں جو رسالہ پیمانہ میں ساغر نظامی صاحب کے نام سے نکلتی رہتی تھیں۔ جن پر سیّد جالب ہی کو نہیں بلکہ اکثر بزرگوں کو شدید اعتراض تھا کہ ادب کے نام سے یہ کیا ’’بے ادبی‘‘ رواج پا رہی ہے۔ وہ نظمیں تھیں بھی واقعی کچھ حد سے گذری ہوئی۔ مثلاً دو ہی نظموں کے چند اشعار ذہن میں رہ گئے ہیں جن سے تھوڑا بہت اندازہ تو ہو ہی جائے گا۔ ایک نظم جس کا عنوان ’’امرود‘‘ تھا اس قسم کے اشعار پر مشتمل تھی کہ ؎

لوگو بہار میوۂ مقصود دیکھنا
کافر ثمر فروش کے امرود دیکھنا
امرود کے گھلاؤ میں کتنا گداز ہے
شاید شباب سینہ سے کچھ ساز باز ہے
تیری طرف جو دستِ تمنا دراز ہے
نیرنگئ شباب کی تصویر ناز ہے
اس ٹوکری سے گوہرِ مقصود پھینک دیں
ہنس کر مری طرف بھی اک امرود پھنک دیں
امرود پر ہیں سرخ حنا رنگ پتیاں

ہر داغ سرخ لب لعلِ کا ہے گماں
گویا کہ چلمنوں میں جدا کر کے ساریاں
بیٹھی ہوئی ہیں سینکڑوں دو شیزہ لڑکیاں

اسی طرح ’’پان‘‘ کے زیرِ عنوان ایک نظم شائع ہوئی تھی اس میں حسب معمول اسی قسم کے اشعار تھے کہ ۔

کثرتِ رنگ و لطافت سے جو ہو یاقوت
وہ زباں ہونٹوں میں رکھ لینے کے قابل کیوں نہ ہو
اٹھو اک پان اپنے دستِ ناز پیرا سے بناؤ
اپنے ہونٹوں میں دبا کر پھر مرے پہلو میں آؤ
اور تمھاری انکھڑیوں میں کیف کے سامان بھی

اس قسم کی نظموں پر عصمت ادب کے محافظ بزرگ کیوں کر خاموش بیٹھتے۔ نتیجہ یہ کہ دوسرے معترضین کے علاوہ سیّد جالب دہلوی نے بھی ہمدم میں ’’ادب کے نام پر فحاشی‘‘ کے زیرِ عنوان ایک اداریہ لکھ دیا لکھنؤ کا مشہور مزاحیہ اخبار اودھ پنچ تو تو ہاتھ جھاڑ کر سیماب، ساغؔر اور پیمانہ کے پیچھے پڑا ہی ہوا تھا اور پیمانہ کی نثر اور نظم دونوں کا مسلسل مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کی نثر کی تحریفوں پر تحریفیں شائع کر رہا تھا کہ:

’’لپاڈ گدیت نائکارناہ کے غمزدہ ہائے متعفن‘‘
’’سنڈ اسِ فطرت کی روح اندوزموری‘‘

وغیرہ وغیرہ۔ مگر سیّد جالبؔ دہلوی کے سا اداریہ نے اس مذاق کو سنجیدہ کروٹ دے دی اور مولانا سیماب کے قصرالادب میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ اس زماہ میں ’’قصرالادب‘‘ سے علاوہ ’’پیمانہ‘‘ کے ایک ہفتہ وار آحبار تاج بھی نکلا کرتا تھا۔ مولانا نے اس میں سیّد جالبؔ کے متعلق ایک ایسا مضمون لکھا جس میں وہ بجائے ادبی بحث کے ذاتیات پر اتر آئے اور سیّد جالبؔ کی افیون نوشی پر

بحث کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے کہ یہ افیون اپنی پین ک سے اس وقت چونکا ہے جب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور یہ اب تک اعتبارات کی لکیر پیٹ رہا ہے۔‘‘ اس مضمون کو دیکھ کر غصہ تو بہت آیا، مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ جھگڑا تھا دو بزرگوں کے درمیان۔ مولانا سیمابؔ بھی میرے بزرگ تھے اور سیّد جالبؔ بھی، فرق یہ تھا کہ سیّد جالبؔ علاوہ بزرگ ہونے کے استاد بھی تھے۔ میں تو شاید پھر بھی چپ ہی رہتا۔ مگر سیّدں صاحب نے مجھ کو طلب فرمایا ارو یہ مضمون دکھا کر ارشاد فرمایا۔ ’’آپ کے مزاحیہ کالم کے لئے سیماب صاحب نے بڑا مواد فراہم کر دیا ہے۔ یہ بحث اب آپ کے اور ان کے درمیان ہوگی۔‘‘ ان ہی دنوں پیمانہ میں ’’ہندوستان کا شاعرِ اعظم‘‘ کے زیرِ عنوان ساغر صاحب کا ایک مضمون سیماب صاحب کے متعلق نکل رہا تھا جس میں اور تو بہت سی عجیب وغریب باتیں تھیں ہی مثلاً علامہ اقبال کے مقابلہ پر علامہ سیمابؔ کی جوڑ وغیرہ وغیرہ مگر مگر ہمدم کی دو دو باتیں‘‘ اسی مسلسل مضمون سے مولانا سیمابؔ کی پیدائش کا قصہ لے اڑیں جو ساغر صاحب کے الفاظ میں یہ تھا کہ:

’’مرمریں گنبد تاج پر بیٹھے ہوئے سفید کبوتر کے بازوؤں میں آفتاب کی پہلی کرن نے سرخ آئینے تیار کیے۔ سرزمین اکبرآباد کو شاعرِ اعظم کے جلووں نے منوّر کر دیا۔‘‘

میں نے ہمدم کے باتوفی کی حیثیت سے اس پر سخت حیرت استعجاب کا اظہار کیا کہ ایک انسان کی پیدائش مس ے کسی کبوتر کا کیسا دخل ہوسکتا اگر مولانا کے شاگرد رشید کو اپنے محترم استاد کی عظمت کا ایسا ہی خیال تھا تو اس قسم کی باتیں لکھتے کہ عین اس وقت جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ سرزمینِ اکبرآباد کے لئے بھی سیمابؔ نام کا ایک آفتاب طلوع ہوا مگر یہ کبوتر کہاں سے آگیا اور اس نے اس پیدائش کو کیوں بلاوجہ ’’غٹرغوں‘‘ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کالم کا نکلنا تھا کہ ہفت روزہ تاج کے اگلے ہی نمبر میں سیماب صاحب کا ایک قطعہ آگیا کہ ۔

ادب باقی ہے اب ان میں نہ استعداد باقی ہے
فقط تاغوتیوں کی فکر مادر ذات باقی ہے

کوئی ہمدمؔ کے ’’باتونی‘‘ سے جا کر صرف یہ کہہ دے
کہ شیطان مر گیا اس کی مگر اولاد باقی ہے

اب کیا تھا گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ ہمدم میں روزانہ ’’دو دو باتیں‘‘ اسی موضوع کے لئے وقف ہوگئیں۔ تاج ہفتہ مس ے ایک بار جلی کٹی سناتا رہا۔ یہ سلسلہ پورے ایک سال جاری رہا یہاں تک کہ خان بہادر سیّد حسین رضوی نے مجھ کو طلب کیا اور فرمایا کہ خدا کے واسطے اب اس سلسلہ کو ختم کرو حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں نے عرض کیا کہ کسی مناسب موقع پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا جائے گا۔ مگر انھوں نے قطعی حکم دے دیا کہ مناسب موقع آپ کو خدا جانے کب ملے آپ فوراً یہ سلسلہ ختم کر دیں۔ اب میں سخت شش و پنج میں مبتلا ہوگیا کہ ایک دم سے یہ سلسلہ کیوں کر ختم کیا جائے کہ اسی دن کی ڈاک سے تاج کا تازہ پرچہ ملا جس میں مولانا سیمابؔ کی تازہ غزل شائع ہوئی تھی کہ۔

میّت نہ مری جا کر ویرانے میں رکھ دینا

اس غزل پر حسب معمول تنقید کی گئی اور مقطع سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اسی مقطع کو اس طویل سلسلہ کا بھی مقطع بنا دیا۔ مولانا کا مقطع تھا۔

سیماب حقیقت میں فطرت کا مسّخر ہے
جذبات کی اک بجلی پروانے میں رکھ دینا

میں نے ’’دو دو باتوں‘‘ میں لکھا کہ ’’ہم کو شروع ہی سے یہ انتظار تھا کہ مولانا سیماب ایک مرتبہ بھی اپنی خامیوں کا اعتراف کرلیں تو ہم یہ سلسلہ ختم کر دیں۔ شکر ہے کہ آج انھوں نے اعتراف کرلیا ہے کہ۔

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

لہٰذا اس اعتراف کے بعد ہم اس سلسلہ کو ختم کر رہے ہیں۔

یہ سلسلہ یوں تو ختم ہوگیا مگر مدتوں یہ حال رہا کہ جب کبھی اس خواہ مخواہ کی جنگ کا خیال

آتا تھا دل ایک عجیب قسم کی ندامت سی محسوس کرتا تھا کہ میں ایک بزرگ کی شان میں کس قدر گستاخیاں کر چکا ہوں اور اس جرم کی سزا مولاناں یماب نے بھی ایسی دی کہ میں شاید زندگی بھر نہ بھول سکوں گا کہ دو سال کے بعد علی گڑھ کے ایک مشاعرہ میں جب وہ اچانک میرے سامنے آگئے تو قبل اس کے کہ میں سر پر پیر رکھ بھاگوں نھوں نے مجھ کو نہایت گرمجوشی سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ’’شوکت صاحب! میں آپ کو ناراض نہ رہنے دوں گا۔ اگر اس قسم کی تلخیاں نہ ہوں تو زندگی کی شیرنی عذاب بن جائے۔‘‘ مولانا کے اس ایک ہی فقرے نے ذہن سے نہ جانے کتنا بوجھ اتار دیا۔ کاش ایسے ہی فیاض بزرگ یہ زمانہ بھی پیدا کر سکتا۔

روزنامہ ہمدم سے ابھی میں وابستہ ہی تھا کہ میرے دوست نسیم انہونوی صاحب نے ایڈیٹر رسالہ ’’انکشاف‘‘ اور امین سلونوی صاحب ایک روز ایک عجیب منصوبہ بنا کر میرے پاس آئے کہ ہم ایک تثلیث قائم کرنا چاہتے ہیں۔ عرض کیا کہ نئی کیوں قائم کر رہے ہو۔ ایسا ہی تثلیث پرستی کا شوق ہے تو پبتسمہ لے لو یہ تثلیث تو مدت سے قائم ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحبان ایک مزاحیہ ہفتہ وار اخبار نکالنے کی دُھن میں مبتلا ہیں شرطیکہ میں بھی تیار ہو جاؤں۔ مجھ کو ان دونوں نے بڑے حکم دلائل کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اودھ پنچ کا دورِ جدید بھی نزع کے عالم میں ہے ارو حکیم ممتاز حسن صاحب ہمت ہار چکے ہیں۔ گنڈے دار تو پہلے ہی سے نکل رہا ہیمگر اب شاید بالکل ہی نہ نکلے۔ ان حالات میں ہم اگر ایک مزاحیہ اخبار جاری کر دیں تو اس کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ امین سلونوی نے اس کا نام ’’لکھنؤ پنچ‘‘ تجویز کیا نسیم انہونوی نے کئی نام تجویز کیے جن میں سے ایک ’’مہا پنچ‘‘ بھی تھا۔ میں نے رائے دی کہ اگر پنچ کو بہت ہی پنچ بنانا ہتو ’’سرپنچ‘‘ کیوں نہ رکھا جائے اس کا نام۔ یہ نام اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ ہم تینوں میں اگر سچ پوچھیے تو عملی ادبی نہ صرف نسیم صاحب نے سرپنچ کے اجرا کے انتظامات نہایت انہماک سے شروع کر دیے۔ دفتر کرایہ پر لیا گیا۔ اس میں تھوڑا بہت فرنیچر آراستہ کیا گیا۔ کاتبوں کا انتظام کیا گیا۔ پریس سے معاملاتی طے کیے گئے دفتری ایسا ڈھونڈا گیا جو دفتری کا دفتری ہو

چپراسی کا چپراسی ہو۔ میرے سپرد صرف یہ کام تھا کہ میں ہمدم کے دفتر سے واپسی پر اس دفتر میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر مضمون نگاروں کو مضامین کی فراہمی کے لئے خطوط لکھا کروں۔ امین لونوی صاحب کے سپرد یہ مہم تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں سے ایک کارٹونسٹ پیدا کر لائیں۔ چنانچہ وہ روز ایک کارٹون لے آیا کرتے تھے کہ آپ لوگ اس کی شکل وصورت پر نہ جائیں۔ اس کی تعلیمی کم مائگی کو نہ دیکھیں۔ اس کی بیوقوفی پر غور نہ کریں۔ یہ اگر مشق کرتا رہا تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ اچھا کرٹونسٹ ثابت ہوگا۔ یہ ایک سائن بورڈ بنانے والے کے یہاں وارنش کرتا ہے۔ کبھی کسی قلعی گر کو پکڑ لائے کہ ہے تو یہ قلعی گر مگر اس سے میں نے وعدہ لیا ہے کہ یہ کارٹون بنانے کی مشق آج ہی سے شروع کر دے گا۔ آخر ایک دن وہ فرنگی محل کے علماء میں ایک متبرک عالمِ دین و مفتی شرع متین کے صاحب زادے کو لے آئے کہ پنچ صاحب آخر کارٹونسٹ مل ہی گیا۔ ان مرشد زادے کا نام تھا کامل اور انھوں نے خود بھی نہایت سنجیدگی سے اپنے کارٹونسٹ ہونے کا اعلان کیا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آ گول میز کانفرنس کا ایک جس سے یہ مفہوم پیدا ہو کہ اس سے کچھ ہونے والا نہیں ہے اور یہ ایک بے نتیجہ کوشش ہے۔ کامل صاحب نے بیٹھے بیٹھے ایک بڑا سا انڈا بنایا جس پر چند مُرغیاں بیٹھائیں۔ کسی مرغی پر گاندھی جی کا سر تھا کسی پر پنڈت مالوی کا کسی پر مولانا شوکت علی کا۔ اسی طرح چند اور رہنماؤں کے سر والی مرغیاں اس انڈے پر بٹھا دیں مگر مگر یہ انڈا نیچے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کارٹون کو دیکھتے ہی کامل صاحب سے کامل معاملات طے کرنے کے لئے نسیم صاحب سے کہہ دیا اور امین سلونوی صاحب کو ان کی اس مہم میں کامیابی پر مبارکباد دی کہ آخر کار جھک مارتے مارتے آپ پالا مارنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ادھر یہ تمام انتظامات مکمل ہو رہے تھے۔ ادھر میرے لکھے ہوئے خطوط کے جواب میں مضامین آنا شروع شرع ہو چکے تھے مگر نسیم انہونوی صاحب کہہ چکے تھے جب تک چھ نمبر آپ مرتب کر کے رکھ نہ دیں گیا اس وقت تک سرپنچ کا پہلا نمبر نہ نکالا جائے گا۔ مجھ کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ مزاحیہ اخبار نکالا جا رہا ہے تو مَح کے معیار سے گرا ہوا نہ ہو اور مذاق بدمذاقی نہ بن جائے۔ جن مزاح نگاروں کو میں نے خطوط

لکھے تھے ان میں سے پطرس، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالکؔ وغیرہ نے تو خط کا جواب ہی نہ دیا۔ البتہ سب سے پہلا جواب مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مع ایک تازہ مضمون کے آ گیا۔ پھر مرزا فرحت اللہ بیگ اور میاں ایم اسلم کے جوابات مع مضامین کے آئے اور اس کے بعد ایک سلسلہ قائم ہو گیا کہ کسی ڈاک میں حضرت خواجہ حسن نظامی کا تبرک آ گیا تو کسی ڈاک سے تمکین کاظمی صاحب کا مضمون۔ مولانا ابن الحسن فکر، مرزا محمد عسکری، حضرت ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، چودھری محمد علی رودلوی اور بہت سے دوسرے بزرگوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے ''اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل'' کے زیرِ عنوان نہایت عبرت انگیز مزاحیہ مضمون بھیجا اور بزرگ محترم سلطان حیدر جوشؔ اور جناب فلک پیما نے تو قطعاً غیر متوقع طور پر اپنے مضامین بھیج کر میرے حوصلہ کہیں کہ کہیں پہنچا دئے۔ ملّا رموزی صاحب نے بھی سرپنچ نوازی میں بڑی فیّاضی سے کام لیا۔

امین سلونوی صاحب اسی دھن میں لگے ہوئے تھے، کہ نئے مزاح نگار پیدا کرو۔ چنانچہ یہ محکمہ انھوں نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا اور نہ جانے کتنے ایسے مزاحیہ مضامین حاصل کر چکے تھے جن کو پڑھ کر دھاڑیں مار مار کر ہنسنے اور کھلکھلا کھلکھلا کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ آخر یہ مضامین ان ہی کے سپرد کر دئے گئے۔ کہ وہ ان کا پرچہ ترکیب استعمال بھی بنائیں کہ ان مضامین میں قاری کو کہاں کہاں ہنسنا اور کہاں کہاں مسکرانا چاہیے تا کہ تا کہ قاری روزنامہ شروع کر دے۔ آخر سرپنچ کا پہلا نمبر بڑی آب وتاب سے شروع کیا گیا اور امید سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ اخباری برادری نے بڑے اچھے تبصرے کئے اور اکابر اہلِ قلم نے بڑی حوصلہ افزائیاں کیں۔ اب مرحلہ یہ درپیش تھا کہ جو معیار اس پہلے نمبر نے قائم کیا تھا۔ وہ قائم رہے اور بلندی سے پستی کی طرف اترنا نہ پڑے۔ اس زمانہ میں ہمدم ایک عجیب بحران میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ملک نصراللہ خاں عزیزؔ سے ہمدم کے ڈائرکٹروں کی نبھ نہ سکی۔ خان بہادر احمد حسین رضوی نے مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نگران مقرر ہوئے مگر وہ بھی

زیادہ وقت نہ دے سکے۔ مشہور کانگریسی کارکن گوپی ناتھ ممتظم ہوئے اور چوہدری رحم علی الہاشمی نے ادارت سنبھالی۔ اس ہڑبونگ میں میرے لئے یہی چارہ کار رہ گیا کہ میں چپکے سے کھسک جاؤں۔ نسیم انہونوی اور امین سلونوی بہت خوش تھے کہ میں اب پورا وقت سرپنچ کو دے سکوں گا مگر مں ے اپنا بار سرپنچ پر ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور منشی نولکشور کے اخبار ''اودھ اخبار'' کی ادارت سنبھال لی۔ سرپنچ کا کام بدستور جاری رہا اور اب سرپنچ نے اپنے لئے اہلِ قلم کا ایک ایسا حلقہ حاصل کرلیا تھا کہ سچ پوچھئے تو انھیں کے بےلوث اور بےساختہ تعاون سے سرپنچ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ نسیم انہونوی خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے۔ ان کے حسنِ انتظام نے سرپنچ کی بنیادیں نہایت مستحکم کردیں۔ اس کے نہایت مہتم بالشان سالنامے اور دوسرے خاص نمبر بھی نکلنے لگے جو بےحد مقبول ہوئے۔ امین سلونوی صاحب نئے مزاح نگار پیدا کرنے کی مہم جاری کیے رہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب بھی رہے اور شکر ہے کہ اب ان کو صرف ان ہی مضامین پر ہنسی آتی تھی جن سے واقعی انبساطی پہلو نکلتا تھا۔ ورنہ پہلے تو وہ اعتقاداً ہنس دیا کرتے تھے چونکہ مضمون نگار نے یہ مضمون مزاحیہ سمجھ کر لکھ دیا ہے لہٰذا اس پر ہنسنا اخلاقی فرض ہے۔

* * *

۷

ادب اخبار صحافت کے بابا آدم کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ادارت مل جانے کو میں اپنی صحافتی معراج سمجھ رہا تھا اس لئے کہ اسی کرسی پر ایسے ایسے نامور لوگ رہ چکے تھے جن کے ڈنکے ہمارے ادب میں آج تک پٹے ہوئے تھے مگر اودھ اخبار کا قلمدانِ ادارت سنبھالنے کے بعد پتہ چلا کہ اب تو یہ روزنامہ عجوبۂ روزگار بن چکا ہے۔ مطبع نولکشور کے مالکوں اس سے کوئی بحث ہے کہ اس کی اشعت کیا ہے۔ نہ اس سے کوئی بحث ہے کہ یہ کتنے نقصان میں چل رہا ہے۔ وہ تو بس اس کو نولکشور آنجہانی کی یادگار کے طور پر نکالے جا رہے تھے نہ اس کی کہیں کوئی ایجنسی تھی نہ خود لکھنؤ کے کسی بازار میں یہ فروغ ہوتا تھا بس چار پانچ سو پرچے وضعداری کے طور پر چھاپے جاتے تھے اور نہ جانے کہاں چھپا دئے جاتے تھے۔ نہ اس کی کسی شہر، قصبہ یا گاؤں میں نامہ نگار تھے نہ کسی اور ہی ذریعے سے خبریں فراہم ہوتی تھیں۔ ہوتا صرف یہ تھا کہ صبح تڑکے لکھنؤ میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات آجاتے تھے اور ان کی تھوڑی بہت خبریں الٹا سیدھا ترجمہ کرکے نہایت پاشان کتاب کے ساتھ شائع کردی جاتی تھیں۔ چند مراسلہ نگار جن کے مراسلے دوسرے اخبار شائع نہ کرتے تھے اپنے مراسلے بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک ایڈیٹر ہوتا تھا اور دوسرا اس کا نائب یہ دونوں مل کر پہلے تو خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ایڈیٹر صاحب اداریہ لکھنے بیٹھ جاتے تھے اور نائب صاحب قینچی ہاتھ میں لے کر ڈاک میں آئے ہوئے تبادلہ کے اخبار کی قطع و برید شروع کردیتے تھے لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس سارے عملہ میں کام کے صرف ایک ہی بزرگ تھے جو اپنے منصب کے اعتبار سے کابت تھے مگر ہر مرض کی دوا۔ اسم مبارک تھا منشی بنوجری لعل اور

تخلص تھا شوخ۔ کتابت اور شاعری تو خیر یہ کرتے ہی تھے مگر اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ مثلاً ایڈیٹر صاحب کی طبیعت موزوں نہیں ہے یا وہ اپنے نائب کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں تو منشی بنواری لعل شوخؔ ہی ایڈیٹوریل بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اور اس ایڈیٹوریل کا کوئٹ جداگانہ مشورہ نہ ہوتا تھا لکہ وہ براہِ راست کتابت ہی کرتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دفتر میں اگر کسی کا دبدبہ تھا تو منشی بنواری لعل شوخؔ کا جو نہ ایڈیٹر کو خاطر میں لاتے تھے نہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کو بلکہ ان کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ ایڈیٹر صاحب کے لکھے ہوئے اداریہ میں جہاں چاہیں اصلاح کر دیں اور ایڈیٹر کو بتا دیں کہ یہ بات تم نے غلط لکھی تھی جس کو میں نے صحیح کر دیا ہیاور یہ سن کر ایڈیٹر کو صرف مسکرانا پڑتا تھا ورنہ منشی بنواری لعل شوخؔ اس کو آٹھ آٹھ آنسو رلانا بھی جانتے تھے۔

ادارت کا چارج لینے کے بعد جب یہ حالت میں نے دیکھے اور جب یہ کیفیات میں نے سنی تو میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ میں کہاں آپھنسا ہوں اور ان حالات میں مجھ سے کیوں کر کام ہو سکے گا۔ منشی پریم چند آنجہانی مشہور افسانہ نگار ان دنوں مطبع نولکشور کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے انچارج تھے اور اودھ اخبار کی تھوڑی بہت نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ میں نے ان حالات کی تفصیل ان کو بتا کر ان سے مشورہ کیا کہ اس طرح میں یہاں کیوں کام کر سکوں گا تو وہ سب کچھ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ ''تو گویا آپ یہاں کام کرنے آئے ہیں۔ بھائی صاحب یہ تنخواہ نہیں وظیفہ بلکہ وثیقہ ہے اور یہ کام نہ کرنے کے معاوضہ میں دیا جاتا ہے۔ آپ اگر یہ سمجھے ہیں کہ یہ اخبار نکلتا ہے تو یہ غلط ہے دراصل اس کی لوچ پر منشی لونکشور کی جو تصویر گول دائرہ میں چھپتی ہے اور اس کے نیچے جو لکھا رہتا ہے کہ بیادگار منشی نولکشور سی۔ آئی۔ وہی بس اس کا مقصد ہے یعنی یہ اخبار کی لوح نہیں بلکہ نولکشور کی لوحِ مزار ہے مالکانِ مطبع کا اعتقاد ہے یہ ہے کہ اودھ اخبار کو بہر صورت جاری رہنا چاہئے اسا لئے کہ اس مطبع کو فروغ حاصل ہوا ہے اور نشی لکشور کو اس سے تعلقِ خاطر تھا اس کے علاوہ اس اخبار کا کوئی مقصد نہیں۔'' میں نے منشی پریم چند سے یہ سن کر بڑی حیرت سے یہ کہا کہ اس بے مقصدی کا شکار آخر میں کیوں کر بن سکوں گا۔ ارو یہ حرام کی تنخواہ

مجھے کیسے ہضم ہوگی تو انھوں نے بدستور خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ ''اگر آپ کا ہاضمہ ایسا ہی کمزور ہے تو اور آپ یہ دعویٰ مسیحائی لے کر آئیں ہے کہ مردے میں جان ڈالیں گے۔ تو آپ اس کے لئے ایک اسکیم تیار کیجیے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ اسکیم آپ کے ساتھ جا کر منشی بُش نارائن بھارگو کے سامنے پیش کروں گا اور جتنا سر کھپایا جا سکتا ہے کھپا لوں گا۔ منشی پریم چند کے اس وعدے کے ساتھ میں ایک مفصل اسکیم تیار کر لی کہ مجھ کو اتنا عملہ درکار ہے۔ میں اس طرح اس کی ایجنسیاں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ شعبۂ اشتہارات کو اس طرح منظّم کرنا چاہتا ہوں۔ بیراونی نامہ نگاروں کے علاوہ اتنے مقامی رپورٹر چاہتا ہوں۔ اخبار کی تربیت، کتابت اور طباعت میں یہ انقلاب چاہتا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ منشی بنواری لعل شوخؔ کو یا تو بالکل ہی نہیں چاہتا یا صرف ایک کاتب کی حیثیت سے چاہتا ہوں جس کا اور کسی بات میں کوئی دخل نہ ہو سکے۔ منشی پریم چند نے پوری سکیم نہایت غور سے سنی۔ منشی بنواری لعل والے حصہ میں یہ ترمیم کیا کہ ان کا نام نہ لکھو بلکہ یہ لکھو کہ دفتر کا نظم و ضبط صرف اسی صورت سے قائم رہ سکتا ہے کہ عملہ کے لئے ایڈیٹر کے احکامات اور ہدایات کو قطعت سمجھا جائے اور اس میں کسی مداخلت کا مجاز نہ سمجھا جائے۔ ایڈیٹر کو اپنے عملہ کے تقرر اور برخاستگی کے کُلی اختیارات حاصل ہوں۔ میں نے اس ترمیم کو اپنے اختیارات کے لئے اور بھی مستحکم سمجھ کر قبول کر لیا چنانچہ منشی پریم چند کی معیت میں منشی بُش نرائن بھارگو مالک مطبع کے سامنے میری پیشی ہوئی۔ جہاں سب سے پہلے منشی پریم چند نے ایک نہایت سلجھی ہوئی تمہیدی تقریر کی۔ اس کے بعد میری اسکیم اس کے سامنے پیش کر دی گئی۔ بدقسمتی سے اس وقت بھارگو صاحب ریس پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور ان کے ذہن میں گھوڑوں کا اصطبل کھلا ہوا تھا۔ انھوں نے اسکیم لے کر رکھ لی کہ میں اس پر غور کروں گا۔

میں نے منشی پریم چند کے مشورے سے منشی بنواری لعل شوخؔ سے نہایت روادارانہ تعلقات قائم رکھے۔ یہاں تک کہ میرے فرائض میں بھی یہ شامل ہو گیا کہ روزانہ ان کی ایک تازہ غزل سنا کروں اور اس کی بے حد داد دیا کروں۔ ایک دن وہ ایک نہایت خوبصورت فریم میں ایک

نہایت طویل فارسی کا قصیدہ لے آئے جو شاہ نادر شاہ والیٔ افغانستان کی شان میں تھا اور منشی بنواری لعل شوؔخ اسے جشن تخت نشینی کے موقع پر سفیر افغانستان مقیم دہلی کے توسل سے بھیجنا چاہتے تھے۔ نہایت لالہ شاہی فارسی تھی اس قصیدے کی ''بوئے کچوری....می آید'' کا اس سے بڑا نمونہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا مگر جب منشی بنواری لعل شوؔخ نے وہ قصیدہ بھیج دیہا تو کچھ ہی دن بعد ان کو ایک انشیورڈ پارسل موصول ہئا جس میں دربار افغانستان کی طرف سے ایک پروانۂ خودی تھا۔ ایک پارکر قلم اور ایک سونے کی گھڑی۔ اب کیا تھا اب تو یہ خود منشی بنواری لعل شوؔخ اس کے مستحق ہوگئے تھے کہ ان کی شان میں ہم سب قصیدے کہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ منشی بنواری لعل شوؔخ کی شاعری نے مجھ کو ایسا عاجز کر دیا کہ میں نے منشی پریم چند سے تقریباً دست بستہ نہایت گڑگڑا کر کہا، کہ جب تک بھارگو صاحب اس اسکیم پر غور کر رہے ہیں۔ کم سے کم مجھ کو منشی بنواری لعل شوؔخ کی شاعری سے تو نجات دلوا دیجئے۔ چنانچہ منشی پریم چند نے اودھ کے خبار دفتر کا معائنہ کیا۔ اسی وقت یہ احکام دے دیے کہ ایڈیٹر کا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا ہونا چاہئے اور اس طرح میں منشی بنواری لعل شوؔخ کی دفتر سے نکل بھاگا۔

اب میں منشی پریم چند کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے پوچھ لیا کرتے تھے کہ ''کیوں بھئی شوکت صاحب! حضرت آدم کی اہلیہ کا کیا نام تھا؟'' اور میں ان سے دریافت کرلیا کرتا تھا کہ ''رکشا بندھن کی تاریخ کیا ہے۔'' اور وہ کبھی میرے بکمرے میں آکر اور کبھی مجھ کو اپنے پاس بلا کر بڑی تفصیل کے ساتھ اس قسم کی معلومات فراہم کر دیتے تھے۔ اسی زمانے میں رسالہ نیرنگِ خیار کے مدیر حکیم حسن یوسف صاحب نے مجھ کو ایک خط لکھا کہ میرا ایک کام کر دو۔ منشی پریم چند سے ایک افسانہ لے کر میر نام وی پی روانہ کر دو۔ چنانچہ مجھ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ افسانے اور مضامین بھی وی پی کیے جاتے ہیں۔ میں نے منشی پریم چند سے کہا تو وہ کچھ چپ سے ہوگئے اور بڑی دیر کے بعد کچھ عجیب شرمائے ہوئے انداز سے کہا کہ میرے لئے یہ بڑا دشوار مرحلہ ہوتا ہے کہ مثلاً آپ کے ذریعہ سے

فرمائش آئی ہےتو میں کیوں کر وی پی بھیجوں اور بھیجوں بھی تو کس رقم کا۔ بہر حال میں افسانہ لکھ لوں پھر دیکھا جائے گا۔ اور دیکھا یہ گیا کہ بہت شرماتے ہوئے منشتی پریم چند نے پچاس روپے کا وی پی بھیج دیا جو فوراً وصول کرلیا گیا۔ اس زمانہ میں اول تو مضامین کے معاوضہ کا سا وال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور معاوضۃ بھی اتنا کہ شرماتے ہوئے گویا بڑی رعایت کے ساتھ پچاس روپے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ کو تو منشی پریم چند پر بہت ہی رشک آیا۔ ادبی رسائل سے مضامین کا معاوضہ لینے کی راہ منشی پریم چند ہی نے مجھ کو سمجھائی تھی مگر ایک افسانہ کا معاوضہ پچاس روپئے دینے والے تو آج بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

وہ اسکیم جو میں نے منشی پریم چند کے ساتھ جا کر بھارگو صاحب کو دی تھی۔ اس کا چھ مہینہ بعد یہ پتہ چلا کہ وہ بھارگو صاحب نے اپنے نہایت قریبی دوست رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف ہسٹری اور اردو لٹریچر کو غور کرنے کے لئے دے رکھی تھی۔ چنانچہ منشی پریم چند نے ایک دن مجھ کو یہ پیغام دیا کہ تم کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے طلب کیا ہے جو اصلاً تو ڈپٹی کلکٹر ہیں مگر آج کل حکومت صوبجات متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ لگے ہوئے ہیں اور پھر ان کے متعلق مجھ کو چند موٹی موٹی باتیں سمجھا دیں کہ وہ آدمی نہایت علاّمہ قسم کے ہے ں چنانچہ تم پر فرض ہے کہ تو ان کو علاّمہ سمجھو اور ان کو یقین دلا دو کہ اگر انھوں نے اردو کا یہ تذکرہ انگریزی میں نہ لکھا ہوتا تو اردو یتیم خانہ میں داخل ہو جاتی گویا قلعۂ معلّیٰ کے بعد معلیٰ القاب اردو کو نصیب ہوا وہ آپ ہی کی ذات والا صفات ہے۔ میں اس قصیدہ خوانی کے لئے تیار ہو کر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک گھومنے والی کرسی پر اردؤ معلّیٰ منہ میں پائپ لئے بیٹھی ہے۔ بظاہر بڑے تپاک سے ملے مگر اس تپاک میں بھی وہ آدمی کم رائے بہادر زیادہ۔ انشاء پردازی کا غازہ ملے ہوئے خالص ڈپٹی کلکٹر ثابت ہوتے رہے۔ اردو سے اتنی دلچسپی وہ ضرور لے رہے تھے کہ انگریزی انداز سے اردو بول رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد ان کی اردو ختم ہو جاتی تھی۔ مجھ سے انھوں نے اودھ اخبار کے متعلق صرف اتنا ہی کہ اسکیم آپ کی

بہت اچھی ہے مگر ذرا مہنگی ہے اور اس کے بعد خود ہی سوال کرلیا کہ آپ نے میری کتاب ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' پڑھی ہے؟ جس کے جواب میں میں نے اپنا وہ قصیدہ شروع کردیا جو منشی پریم چند پہلے ہی میرے کانوں میں پھونک چکے تھے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نہایت غور سے یہ قصیدہ سنتے رہے اور ان کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ قصیدہ گو شاعر کو خلعتِ فاخرہ سے نوازنے ہی والے ہیں۔ چنانچہ قصیدہ ختم ہوتے ہی انھوں نے گھنٹی بجائی۔ یقیناً یہ گھنٹی خلعتِ فاخرہ طلب کرنے کے لئے بجائی گئی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی چپراسی داخل ہوا آپ نے حکم دیا:

''چائے لاؤ''

اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ میں اس کا دوسرا حصہ بھی تیار کر رہا ہوں جس میں اس وقت کے تمام ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہوگا۔ مگر مصروف اس قدر ہوں کہ وقت نہےں ملتا۔ مثلاً یہ گروپ دیکھیے۔ میں نے جب اس گروپ کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں پہلے ہی یہ گروپ دیکھ چکا ہوں یہ پہلی گول میز کانفرنس کا گروپ تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس تصویر میں ایک موہوم سے سایہ پر انگلی رکھ کر کہا:

''ان کو پہچانتے ہیں آپ؟''

میں بھلا اس بے خدو خال دھبہ کو کیا پہچانتا۔ ابھی اس کو دیکھ ہی رہا تھا کہ آپ نے فرمایا:

''یہ میں ہوں۔ دماغ کا عرق نکال کر آیا ہوں گول میز کانفرنس میں مگر وہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس مصیبت کو گول میز کانفرنس میں مدعو کرلیا تھا۔''

میں ان کی مرضی کے مطابق اس گروپ کو دیکھ کر اور ان سے مرعوب ہوگیا مگر بعد میں صرف یہی کہا کہ آپ کی یہ سیاسی اور سرکاری ذمہ داریاں کاش آپ سے اردو کی حق تلفیاں نہ کرائیں۔ آپ نے سا یتیم بچی کے سر پر ہاتھ رکھا ہے تو اس کو پروان بھی چڑھا دیجیے۔ یہ سن کر بسکٹ کی طشتری میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا:

''یہ لیجئے نا۔''

ایک ہفتہ کے بعد منشی پریم چند نے مجھ کو چند کاغذات دیتے ہوئے کہا کہ تمھاری اسکیم بڑی حد تک منظور کرک لی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو خاصہ شیشہ میں اتار چکے ہو، اور اب مجھ کو بتانا پڑا کہ اس عرصہ میں تین پیشیاں ہوچکی ہیں اور تین قصیدے میں سنا چکا ہوں۔ بہر حال میں اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ منشی بنواری لعل شوؔخ کے بجائے مجھ کو رام بابو سکسینہ کی دربار باریاں کرنا پڑ رہی ہیں اور ان کا یہ صلہ بھی مل گیا ہے کہ میری اسکیم بڑی حد تک منظور ہوگئی ہے۔

ابھی اس اسکیم پر عمل درآمد شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نولکشور اسٹیٹ مع روزنامہ اودھ اخبار کے کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ منشی پریم چند کچھ دن پہلے ہی بنارس جا چکے تھے۔ میرے لئے بھی اب اودھ اخبار میں رہنا ممکن نہ رہا۔

☞

۸

روز نامہ ہمدم کا دور ہو یا روز نامہ اودھ اخبار کا۔ ہر دور میں علاوہ صحافتی انہماک کے ادبی دور میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا اور سرپنچ کو زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کی دُھن بھی سوار رہی مگر میرے لئے خود میرا ہی ایک مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' اچھی خاصی مصیبت بن چکا تھا۔ یہ مضمون میں نے ۳۰ء میں رسالہ نیرنگِ خیال لاہور کے سالنامے کے لئے لکھا تھا۔ جہاں سے وہ نہ جانے کتنے دوسرے رسائل میں نقل تو کیا ہی گیا مگر اس کے ترجمے بھی اتنے اور اتنی زبانوں میں ہوئے کہ ہندوستان کی علاقائی زبان کے علاوہ تین تو صرف انگریزی کے ترجمے ہوئے ایک وہ جو رفیع احمد خاں مرحوم نے کیا۔ دوسرا اوہ ج وگلوب لندن میں شائع ہوا اور تیسرا اوہ ج وامرت بازار پتریکا میں نکلا۔ یہ ترجمے ہوتے رہتے اور یہ مضمون اس بھی زیادہ نئے نئے قالبوں میں ڈھلتا رہتا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا مگر جس وجہ سے یہ مضمون میری چڑ بن گیا۔ وہ یہ تپی کہ اس کے بعد میں نے اور بھی بہت سے مضامین لکھے جن میں بعض خود مجھے سودیشی ریل سے زیادہ پسند تھے مگر ان مضامین کی داد بھی مجھ کو اس طرح ملتی کہ:

''خوب ہے صاحب آپ کا یہ مضمون بھی، جواب نہیں ہے مگر سودیشی ریل۔''

ادبی رسائل کی طرف سے فرمائشیں کچھ اس قسم کی آتی تھیں کہ ''ہمارے لئے آپ سودیشی ریل کی قسم کا ایک وسدیشی ڈاکخانہ لکھ دیجیے۔'' اور ''ہمارے لئے ایک مضمون سودیشی یونیورسٹی کے کے نام سے لکھ دیجیے جو آپ کی سودیشی ریل کی قسم کا ہو۔'' عاجز آگیا تھا ان فرمائشوں سے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جلنے لگا تھا سودیشی ریل کے نام سے کہ اس ایک مضمون نے مجھ کو ایک عجیب سودیشی جھنڈا بنا کر رکھ دیا ہے۔ لاکھوں لوگوں سے کہتا کہ خدا کے لئے سودیشی ریل لکھنے کے اس قصور کو بخش دو مگر توبے کیجیے کہ وہ کہاں بخشنے والے تھے خط وکتابت ہو یا آمنے سامنے کی گفتگو۔ یہ بات وہ بات اور سودیشی ریل اور میرا یہ حال کہ جس طرح بعض لوگ اِمرتی سے یا گلاب جامن سے چِڑنے لگے ہیں کہ جہاں امرتی اور گلاب جامن کا نام آیا۔ وہ پٹری سے اترے اور لگے اول فول بکنے۔ کچھ اس قسم کی کیفیت میں میں اپنے کو مبتلا ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کیفیت کو چھپانے کے لئے بظاہر سودیشی ریل کے ذکر پر مسکرا دیا کرتا تھا مگر کسی کو کیا معلوم کہ اس مسکراہٹ کی تہہ میں کتنے پیچ وتاب ہوتے تھے۔ عام لوگوں کا تو ذکر نہیں ان کو تو میں ڈانٹ بھی دیتا تھا کہ کیا سودیشی ریل کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، دوسرے مضامین بھی تو دیکھو مگر ان بزرگوں سے کیا کہتا جو مجھ کو کسی طرح بخشنے کو تیار نہ تھے۔ ریل میں کسی کو ذرا سی تکلیف ہوئی اور اس نے سودیشی ریل کو اور اس کے ساتھ ہی مجھ کو یاد کیا۔ حد یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد بھی اس سلسلہ نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے بزرگ کا ایک دن پوسٹ کارڈ چلا آرہا ہے کہ ''بلرام پور جا رہا تھا۔ گورکھپور پہنچ گیا ہوں۔ سودیشی ریل یاد آرہی ہے۔ تجھے ہم ولی....''

اگر کسی کو سیکنڈ کلاس ٹکٹ لے کر تھرڈ یا انٹر میں سفر کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے سودیشی ریل کا نعرہ بلند کر دیا۔ خیر یہ سلسلہ تو آج تک جاری ہے کہ ٹرین لیٹ ہو جائے تو سودیشی ریل' اس کا اندھن ختم ہو جائے تو سودیشی ریل' اس کی رفتار سست ہو جائے تو سودیشی ریل مگر میں تو اس وقت کا ذکر رہا ہوں جب سودیشی ریل کا میں ڈرائیور بن کر رہ گیا تھا کہ جو بھی مجھ سے ملا یا جس بھی میں ملا، اس نے سودیشی ریل چلانے علاوہ اور مجھ کو کسی قابل نہ سمجھا اور میری قسمت میں صرف یہی ایک موضوع گفتگو رہ گیا۔

یہ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ شملہ میں علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری کے یہاں قیام کی سعادت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر جعفری کا مزید تعرف کرانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے دو

صاحبزادگان کا ذکر کیا جائے جو پاکستان میں بہت کم لوگوں کے لئے اجنبی ہوں گے ایک مشہور صحیفہ نگار سید فرید جعفری ہیں اور دوسرے مشہور سی۔ ایس۔ پی آفیسر سید سعید جعفری جو لاہور کی ڈپٹی کمشنری سے لے کر مختلف محکموں کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ بہر حال میرے ادبی مراسم چونکہ سید فرید جعری سے تھے لہٰذا انھوں نے شملہ میں مجھ کو کہیں اور ٹھہرنے نہ دیا اور ہوٹل سے زبردستی میرا سامان گھر لے آئے۔ یہاں ان کے والد محترم علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ جو اپنی اولاد کے تو باپ سے زیادہ دوست تھے ہی۔ میر ساتھ بھی خوردی اور بزرگی کا رشتہ چھوڑ کر وہی دوستانہ مراسم شروع کر دیے۔ ہر چند کے ان کے علمی تبحّر اور ادبی ہمہ گیری کے مقابلہ میں میری کوئی حیثیت ہی نہ تھی اور میں اس قابل بھی نہ تھا کہ ان کے سامنے لب کشائی کر سکوں۔ مگر انھوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ مجھ سے کوئی بلند یا میں ان سے کوئی پست حیثیت رکھتا ہوں۔ ایک سطح پر آ کر ایسا مسفقانہ رویہ اختیار کرنا کہ اس پر بزرگانہ سفقت کا بھی گمان نہ ہو۔ یہ ان کا وہ کمال تھا جس کی مثال پھر کبھی کہیں مل نہ سکے گی۔ مگر ان بزرگ محترم نے بھی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سودیشی ریل کا ذکر آخر چھیڑ ہی دیا اور ان مقررہ باتوں کے علاوہ جو اس سلسلہ میں سب ہی کرتے تھے۔ ایک نئی بات یہ بھی کہی کہ اس کو مضمون کی صورت میں لکھ کر آپ نے اس کی ہمہ گیری اور اس پُرمحل ہونے کا حق ادا نہیں کیا ہے اس کو اب بھی کتابی صورت میں شائع کر دیجیے۔

اسی شام سر محمد ظفر اللہ خان سے لنے ان کی کوٹھی پر گیا جو ان دنوں وائسرائے کی انگیزکٹو کونسل میں رلوے ممبر تھے یہاں س ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ چونکہ سر ظفر اللہ ریلوے ممبر تھے اور میں نے سودیشی ریل لکھی تھی۔ لہٰذا یہ ملاقات اس نسبت کے تحت ہوئی ہوگی۔ حالا کہ اس ملاقات کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سر ظفر اللہ جب کبھی لکھنؤ جاتے مجھ ک و برابر طلب فرماتے رہتے تھے۔ لہٰذا اب میں شملہ آیا تھا تو میرا فرض تھا کہ میں ان سے ملتا چنانچہ وہاں بھی اب کی نہ تو شعر و شاعری کا تذکرہ چھڑا نہ کوئی اور ادبی بحث۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد کہنے لگے کہ آپ

نے سودیشی ریل میں اس قدر اختصار سے کیوں کام لیا ہے لذیذ حکایت کو تو دراز ہونا چاہئے۔ اسے کتابی صورت میں چھپنا چاہئے تھا۔ اب تو مجھے قائل ہونا پڑا کہ ؎

بہ ہرزمیں رسیدیم آسماں پیدااست

مگر اب میرے ذہن میں بھی یہ خیال کچھ جم سا گیا کہ اگر یہ سب کہہ رہے ہیں تو کیا مضائقہ ہے کہ اس کو ایک چھوٹی سی کتاب کی حیثیت سے شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے سر ظفر اللہ کے یہاں سے واپس آ کر خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین جعفری سے یہی کہا کہ جو کچھ آپ فرما رہے تھے۔ وہی بات سر ظفر اللہ نے بھی کہی ہے کہ اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس اجمال کو واقعی تھوڑی تفصیل میں لا کر کتابی صورت کیوں نے پیش کر دیا جائے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر جعفری نے مشوروں کے دفتر کھول دیے کہ اول تو اس پلاٹ میں تھوڑا سا پھیلاؤ پیدا ہو جائے۔ دوسرے اسی کتاب میں انگریزی ترجموں میں سے ایک ترجمہ بھی شامل کر دیا جائے۔ تیسرے اس کو سر ظفر ہی کے نام معنون کر دو۔ میں بے ساختہ بول اٹھا۔ چوتھے اس کا مقدمہ ڈاکٹر نجم الدین جعفری سے لکھوایا جائے۔ بڑی زور سے ہنسے مگر فوراً سنجیدہ ہو کر کہا:

”میں اس مقدمہ بازی کے لئے تیار ہوں اور مجھے بڑی مسرت ہوگی اس پر مقدمہ لکھتے ہوئے۔“

شملہ سے واپسی کے بعد میں نے سودیشی ریل کے اجمال کو تفصیل میں لانے کا کام شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس زمانہ میں دہلی کے مشہور آرٹسٹ سمیع دہلوی لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اور لکھنؤ مں ے ان کی انگشتری گھڑی کے بڑے چرچے تھے کہ اس گھڑی کے بہانے یہ فنکار سارے شہر کو انگلیوں پر نچاتا پھرتا۔ نواب سائل مرحوم نے تو صرف یہی کہا تھا کہ ؎

انگلیاں اٹھنے لگیں داغؔ کا داماد آیا

مگر ان کے لئے تو کسی ایسے مصرعے کی ضرورت تھی جو اس قسم کا ہوتا کہ انگلیاں اٹھنے لگیں انگلی گھڑی والا آیا۔

بہر صورت سمیع صحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ سودیشی ریل کو کتابی صورت میں پیش کرنا ہے۔ لہٰذا اس کی صورت گری آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ کہنے لگے مصوف بہت ہوں بہر حال دکھا جائے گا۔ اور پھر انگلی میں وقت دیکھ کر کہا:

’’ابھی دس منٹ باقی ہے موہن لعل سکسینہ کے آنے میں، جن کو میں وقت دے چکا ہوں جب تک تمھارا ایک اسکچ ہی بنا دوں۔ ادھر دیکھو دروازے کی طرف۔‘‘ اور بجائے دس منٹ کے غالباً چھ سات منٹ میں انھوں نے ایک اسکیچ گھسیٹ دیا اور فرمایا کہ ’’ایک تو یہ اسکیچ جائے گا اس کتاب میں۔ دوسرے میں اس کا سرورق بنا دوں گا۔‘‘

قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ’’بس یہی دو چیزیں اس کتاب کو غیر فانی بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔‘‘

سمیع صاحب نے اس موقع پر کسی کسر نفسی کو خاکساری کو ضروری نہ سمجھا بلکہ سگار کا کش لیتے ہوئے ان صاحب کو موقع دیا کہ وہ اس قسم کی چند باتیں اور کہیں اور جب انھوں نے اور کوئی بات نہ کہی تو سمیع صاحب نے اپنے اس سگار کی تاریخ پر روشنی ڈالنا شروع کر دی کہ ہاؤس آف لارڈز کے صرف چند ڈیوک اور ارل ایسے ہے ل جو یہ سگار پینے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہوں۔ مولانا محمد علی البتہ کبھی کبھی یہ سگار پیتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے ایک بکس منگا لیا تھا۔ اب وہ ختم ہو رہا ہے اور میں پریشان ہوں کہ اب کیا ہوگا؟‘‘ اور پھر انگلی مس ے وقت دیکھ کر کہا کہ ’’ارے کوئی ہے؟‘‘ اور ملازم لڑکا جب دوڑا ہوا سامنے آ گیا تو اس سے کہا۔ ’’دیکھ ایک کانگریسی لیڈر ہیں موہن لعل سکسینہ وا گر آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ آپ نے صاحب سے جو وقت لیا تھا وہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب ملاقات نہیں ہو سکتی۔‘‘

اتنے بڑے آرٹسٹ سے سرورق بنانے کا وعدہ لے کر اور اسکیچ بنوا کر میں تو ادھر سودیشی ریل کے اجمال کو تفصیل میں لانے میں مصروف ہو گیا۔ ادھر خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین جعفری سودیشی ریل کا مقدمہ لکھتے رہے اور سر محمد ظفر اللہ نے میری استعدا پر اپنی تازہ تصویر بھی بھیج دی اور مجھ کو اس کی اجازت بھی دے دی کہ میں سودیشی ریل کو ان کے نام معنون کر دوں۔ اسی دوران ڈاکٹر نجم الدین جعفری کا ایک خاص مکتوب بھی ملا۔ جس میں مجھ کو بزرگانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اس کتاب کی طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں یا اس کی کاپیاں اعانتاً خریدنے کے سلسلہ میں اگر کوئی سرکاری پیش کش ہو تو اس کو ہرگز قبول نے کرنا۔ اس لئے کہ تم نے یہ مضمون خالص ادبی نیت سے لکھا ہے اور تمھارا مقصد کوئی پروپیگنڈا ہرگز نہ تھا۔ لہٰذا بلا وجہ کوئی لیبل کیوں اس کتاب پر لگے۔ ڈاکٹر جعفری کا یہ مشورہ اس قدر مناسب تھا کہ اس کا احساس مجھ کو اس وقت ہوا جب لکھنؤ کانگریس سشن کے موقع پر چند کانگریسی رہنماؤں کی محفل میں پنڈت کشن پرشاد کول نامی ایک بزرگ نے سودیشی ریل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے تمام نسخے خرید کر جلا دینا چاہئیں۔ تو پنڈت مدن موہن مانوی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس طرح آپ گویا اپنے اوپر طنز کرنے والے کو انعام دینا چاہتے ہیں کہ وہ روز ایک اڈیشن چھاپے۔ روز آپ وہ پورا اڈیشن خریدیں اور روز اس کو جلائیں۔ جائے اس اشتعال کے آپ اس کتاب سے یہ کام بھی تو لے ہیں کہ اس میں اپنی خامیوں کو دیکھیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کریں، گویا میرے دن پھر جانے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا مگر وہ بھی ایک بزرگ کے تعصب سے مجھ کو حاصل نہ ہو سکا اور میں سودیشی ریل لکھنے کے باوجود کھدّر ہی رہا۔

☞

۹

لالہ دیش بندھو گپتا کے اخبار روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر شری رام لال ورما، مالکانِ تیج سے کسی بات پر لڑ لڑا کر لکھنؤ آ گئے تھے اور لکھنؤ سے اپنا ذاتی روزنامہ ’’ہند‘‘ نکالنے کے لئے نہایت وسیع انتظامات میں مصروف تھے۔ لکھنؤ میں ان کے مشیرِ خاص جناب امین سلونوی تھے جو اس طرح کے انتظامات میں برابر کے شریک تھے۔ گویا اس اخبار کی کامیابی یا ناکامی خود ان ہی کی عزت و آبرو کا سوال تھا۔ چنانچہ آج کل وہی مجھ کو گھیرے ہوئے تھے کہ میں روزنامہ ’’ہند‘‘ کی کچھ اس قسم کی اداری سنبھال لوں کہ ادارت مے ں کروں اور نام ہو شری لال ورما کا۔ دوسری طرف مولوی عبدالرؤف صاحب عباسی مجھے اپنی پرف کھینچ رہے تھے کہ مے ں ان کی روزنامہ ’’حق‘‘ سے وابستہ ہو جاؤں۔ خیر ان کو تو میں صاف جواب دے چکا تھا کہ میں دوستی کو ملازمت پر قربان نہیں کر سکتا اور احباب کی نیاز مندی تو خیر دوسری چیز ہے مگر ان کو آقا اور اپنے کو غلام بنانا گوارا نہیں کر سکتا۔ مگر امین سلونوی صاحب وہ بلائے بے درماں تھے کہ ان سے مفر ممکن نہ تھا۔ آخر کار شری رام لال ورما سے شرائط طے ہوئیں۔ تنخواہ کا مول تول ہوا اور جب میں نے دیکھا کہ میری ہر شرط وہ منظور کر چکے ہیں تو اخبار ہند سے وابستہ ہونا ہی پڑا۔

شری رام لال ورما تو نہایت معقول اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ جو باوجود کھدّر پہننے کے مزاجاً نہایت ریشمی آدمی واقع ہوئے تھے مگر ان کے تھے ایک سالے جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں اس لئے ان کو روزنامہ ہند کا پورا عملہ لالہ گڑبڑ لال ورما ہی کہا کرتا تھا۔ اور ان کا یہ نام ان کے اصل نام سے زیادہ ہی زبانوں پر تھا اور تھے بھی وہ ایسے گڑبڑ قسم کے آدمی کہ اگر ان سے پوچھا

جا سکتا تھا تو صرف یہ کہ۔ ’’اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔‘‘ مگر ان کو جنرل منیجر بنا دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان بیچارے کو اخباری صنعت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ حد یہ کہ کاغذ کے مختلف سائز بھی ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے کہ یہ ۲۹×۲۲ اور ۱۸×۲۲ کیا بلاہ۔ کتابت کی روشنائی اور بلیو بلیک مے ں فرق کیا ہوتا ہے۔ وہ یہ کبھی سمجھ ہی نہ سکے۔ البتہ جس ایک کام میں وہ ماہر تھے وہ یہ تھا کہ اپنے بہنوئی کے ڈھول پیٹتے رہیں اور اگر ہو سکے تو ان کو اوتار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کروں۔ میں اگر ڈرتا تھا صرف ان کی حماقت مآبی سے ڈرتا تھا اور میرے دل کو کچھ یقین سا ہو گیا تھا کہ یا تو ان کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے یا میرے ملک الموت اگر ثابت ہوں گے تو صرف یہ ان کی ایک ایک بات پر خون کے گھونٹ پی کر تہ جانا پڑتا تھا اور یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جانے کی بات بھی ہے مثلاً چلے آ رہے ہیں اپنی دھوتی سنبھالے اور پیر سے نکل بھاگنے والی چپل کا پیچھا کرتے ہوئے کہ ’’شوکت صاحب آج ایڈیٹوریل نہ لکھیے گا۔ آج بھائی صاحب خود لکھ رہے ہیں۔ اچھا یہ بتایئے کہ آج پرچہ کینا بڑھوا دیا جائے۔ بھائی صاحب کا اڈیٹوریل ہے تو ظاہر ہے کہ پرچے کی مانگ بہت بڑھ جائے گی۔ تیج میں تو یہ ہوتا تھا کہ جس بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل ہوتا تھا ہزار بارہ سو پرچہ زیادہ چھاپا جاتا تھا۔‘‘

عرض کیا کہ ’’بس اتنا ہی یہاں بھی برھوا دیجیے گا مگر ہاکروں کو سمجھا دیجیے کہ وہ بجائے خبروں کی سرخیوں کہ آواز لگانے کے اڈیٹوریل کے آواز لگائیں۔‘‘

کہنے لگے۔ ’’یہ ٹھیک ہے‘‘، عین اسی وقت کسی کاتب نے کسی کو زور سے آواز جو دی تو یہ گڑبڑا کر اٹھے اور دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے کہ یارو کچھ تو خیال کرو بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں اور تم یہاں چیخ رہے ہو۔ تیج میں تو یہ ہوتا تھا کہ جس دن بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھتے تھے ایک مکمل سناٹا رکھا جاتا تھا چپراسی ہر طرف دبے پاؤں گھسٹتے رہتے تھے کہ جہاں کسی نے ذرا بھی اونچی آواز میں بات کی اور وہ اس کو خاموش کر دیتے تھے اور پھر بیٹھے ہیڈ کاتب سے مشورہ کر رہے ہیں کہ بھائی صاحب جو ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں وہ کس کاتب سے

لکھوایا جائے۔ تیج میں تو یہ ہوتا تھا کہ جس دن بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھتے تھے منشی عبدالستار پروین رقم کو بلایا جاتا تھا اور انھیں سے وہ ایڈیٹوریل لکھوایا جاتا تھا۔ ان کے ذمّے صرف بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل ملکھنا تھا اور ہفتہ میں زیادے سے زیادہ ایک مرتبہ ان کی طلبی ہوتی تھی مگر جیسا بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل ہوتا تھا ویسے ہی منشی عبدالستار پروین رقم موتی پرو دیتے تھے۔ کاتب تو آپ جانتے تھے کہ کس خوش نویسی کے ساتھ بڑے بڑوں کو احمق بنا دیتے تھے۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہتے کہ صاحب اتنا بڑا کاتب تو یہاں چراغ لے کر ڈھونڈے بھی نہ ملے گا۔ البتہ یہ ایڈیٹوریل آجانے دیجیئے۔ میں خود اس کو منشی شمس دین کے مزار پر بیٹھ کر لکھ لاؤں گا۔ اور اس پر وہ سنجیدگی کے ساتھ چونک پڑتے کہ ''نہ نہ نہ۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ ایڈیٹوریل دفتر کے باہر جائے۔ تیج میں ایک مرتبہ یہی ہوا تھا کہ بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل نشی پروین رقم نے گھر پر لکھنے کو منگا لیا۔ نہ جانے وہ ایڈیٹوریل کس کس طرح ہندوستان ٹائمس کے ہاتھ لگ گیا لہٰذا دوسرے دن اسی کا ترجمہ ہندوستان ٹائمز کا ایڈیٹوریل بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے سخت احتیاط کی جاتی ہے کہ بئائی صاحب کے ایڈیٹوریل کی تو کسی کو چھپنے پہلے ہوا بھی نہ لگے اور اسی وقت گلی میں اگر باہمی کشیدگی کی وجہ سے چند کتوں میں تو تو میں میں ہوگئی تو ہمارے گڑ بڑ لال ورما کی سراسیمگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی کہ بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں اور یہ نامعقول کتّے شور برپا کئے ہوئے ہیں۔ وہ ان کتوں کو کبھی چپل گھسیٹ کر مارتے تھے کبھی ان کے پیچھے دوڑتے تھے اور اگر بھئای صاحب کے ایڈیٹوریل لکھنے کا خیال نہ ہوتا تو شاید ان پر بھونکنا بھی شروع کردیتے۔

یہ گھبراہٹ اور یہ وحشت ایک دن کی بات نے تھی۔ یہ تو ان کی روزمرّہ کی بے ساختگی تھی کام تھا جنرل منیجری جو بے چارے کلرک کرتے تھے۔ اس لئے کہ اول تو یہ کام آتا ہی نہ تھا اور اگر آتا بھی ہتا تو بھائی صاحب کی قصیدہ خوانی سے ان کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔ روزانہ ڈاک کا پلنڈہ لے کر میرے کمرے میں آتے تھے اور سب سے پہلی بات یہی کرتے، کہ آج کی ڈاک میں بھی تیج آیا ہے۔ گویا اب تک تو بند ہوا نہیں۔ ورنہ عام خیال یہ تھا کہ بھائی صاحب کے آجانے کے بعد اس کا ایک ہفتہ بھی نکالنا مشکل ہوجائے گا۔ اشاعت تو سنا ہے کہ ہزاروں سے گر کر ایک چند سو رہ گئی ہے مگر دھرم پال گپتا وغیرہ اس کو زبردستی اور نقصان اٹھا اٹھا کر نکالے جارہے ہیں مگر دیکھ لیجئے کیا حال ہوگیا ہے عجیب عجیب قسم کے ایڈیٹوریل نکل رہے ہیں اور نساہیکہ دہلی مں ے جتنے تیج پڑھنے والے تھے وہ اب ہاکروں سے ہند مانگ رہے ہیں۔ اور تیج اٹھا اٹھا ک ہاکروں کے منہ پر مار رہے ہیں۔ کبھی کوئی مراسلہ لئے چلے آرہے ہیں کہ یہ دیکھئے شوکت جی یہ لکھتا ہے کہ اردو صحافت مے ں ہند کا ااضافہ اردو کے اخبارات کی بلند اقبالی ہے۔ میرے حیال میں یہ مراسلہ ذرا جلی قلم سے لکھوا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ میں اس کی بیہودہ باتوں کو اس کان سُن اس کان اُڑا دیا کرتا تھا اور اس بات سے شری گڑبڑ لال ورما کچھ زیادہ خوش نہ تھے اور سب سے زیادہ ناخوش تو اس بات سے تھے کہ جب کبھی شری رام لال ورما مجھے کوئی خاص مشورہ کرنے کو اپنے کیمرے میں بلاتے تھے تو آپ بھی نہایت معتبر بن کر بلاوجہ آکر بیٹھ جایا کرتے تھے جن کو دیکھتے ہی رم لال جی کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے تھے مگر ''ساری خدائی ایک طرف۔'' کو آخر کیا کرتے۔ اگر وہ خاموش بیٹھے رہتے تو پھر بھی غنیمت تھا۔ مگر وہ اخبار کی سیاسی پالیسی میں بھی دخل دینا شروع کردیتے تھے اور اس وقت رام لال جی کو مجبوراً کہنا پڑتا تھا کہ یہ بڑا اہم مشورہ ہے۔ آپ ذرا دس منٹ کے لئے ہم کو تنہا چھوڑ دیں۔ اور اس کے بعد آپ کی قیمتی رائے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ وہ جاتے ہوئے کہتے کہ ٹھیک ہے کہ پہلے آپ لوگ باتیں کریں اس کے بعد مے ں اپنی تجویزیں پیش کروں گا۔ بہرحال اخبار کا باتصویر ہونا بہت ضروری ہے۔

ان کے جانے کے بعد رام لال ورما منہ بنا کر دانت پیستے اور پھ نہیت بیزاری کے ساتھ پوچھتے کہ ''ان کا کچھ علاج بتائیشوکت صاحب۔ یہ تو میرے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن کر رہ گئے ہیں۔ جو نہ نگلی جالے نہ اگلی جائے۔ اپنے نزدیک یہ برا خلوص برتتے ہیں مگر خدا محفوظ رکھے

ایک بیوقوف کے خلوص سے، زندگی عذاب ہوکر رہ گئی ہے۔ یہ میری بیوی کے بھائی ہیں۔ بیروزگار تھے لہٰذا میں اس کو یہاں لے آیا ہوں لیکن جائے کوئی مدد کرنے کے یہ تو میرے رلئے مشکلات پر مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسی سڑی ہوئی بات کرتے ہیں کہ دماغ پر گندہ ہوکر رہ جاتا ہے۔” اب میں ان سالے بہنوئی کی بات میں کیا دخل دیتا۔ البتہ یہ ضرور ان کان میں ڈالتا رہتا تھا کہ اگر یہ حضرت میرے ناصح مشفق ننے کی کوشش کریں گے تو کسی نہ کسی دن بات بڑھ جائے گی۔ مگر رام لال ورما نے مجھ کو یہی مشورہ دیا کہ آپ ان کو زیادہ منہ لگایئے ہی نہیں وراس قسم کی باتوں پر ان کو ڈانٹ دیا کیجئے۔ کہنے کو تو رام لال ورما نے کہہ دیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ گھٹنے پر بھی پیٹ کی طرف جاتے ہیں۔ رشتہ داری پھر بھی رشتہ داری ہے اور سسرالی رشتہ داری تو بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ لہٰذا میں ان گڑ بڑ رام ورما کی باتیں جہاں تک ہوسکا برداشت کرتا رہا۔ مگر ایک دن وہ نوبت آہی گئی جس کا ڈر تھا۔ یہ حضرت کاتب کے پاس سے میری ایک نظم لے کر آ گئے کہ “شوکت جی! اس نظم کی اس رباعی کو ذرا پھر دیکھ لیجئے میرے حیال مس ے اس میں سکتہ پڑتا ہے۔”

میں آپ سے کیا عرض کروں کہ مجھ کو کتنا غصہ آیا ہے مگر میں نے اس غصہ کو پی کر صرف یہ کیا کہ بجائے ان سے کچھ کہنے کے میں نے اس کاتب کو طلب کیا جس یہ نظم لکھنے کو دی گئی تھی اور اس پر سارا غصہ اتارتے ہوئے کہا کہ میری لکھی ہوئی چیز تم نے ان کو کیوں دی اور یہ کیونکر تمھارے پاس سے یہ نظم لے کر میرے پاس آئے۔ کاتب بیچارہ بھی بے قصور تھا اس نے کہا صاحب میری کیا مجال تھی کہ ان کو روکتا۔ انھوں نے نظم اٹھا کر پڑھی اور کہا کہ شوکت جی نے جلدی میں اس سنظم کی ایک رباعی ناموزوں لکھ دی ہے اس میں سکتہ پڑتا ہے۔ میں نے اور بھی غصے میں کہا کہ جو شخص اتنا جاہل ہو کہ نظم مس ے رباعی کہتا ہے وہ لایا ہے یہ نظم میرے پاس کہ میں اپنی غلطی پر نظر ثانی کروں۔ خبردار جو آئندہ میری کوئی تحریر یا کوئی نظم بغیر میری اجازت کے کسی اور کو دکھائی تم لوگوں نے، اور آ بھی کان کھول کر سن لیجئے مسٹر کہ میں اس قسم کی بیہودگی برداشت کرنے کو تار نہ ہوں گا۔”

بھی میں نہایت بلند آواز سے یہ نکال ہی رہا تھا کہ رام لال ورما بھی گھبرائیہوئے میرے کمرے میں آ گئے اور جب ان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو ان کی نتھنے بھی پھول گئے اور انھوں نے بھی تیوریوں پر بل ڈالکر اپنے سالے سے کہا کہ “آپ کی اپنے متعلق غلط فہمیاں کچھ بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ کو اتنے دن کے بعد بھی پرہ نہ چلا کہ شوکت صاحب میرے لئے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور میرے اخبار کے لئے یہ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو نہ شاعری کی خبر نہ شاعری کی دم کی۔ آپ کو آخر حق کیا تھا اس حماقت کا۔” میں نے ان کا غصہ دھیما کرتے ہوئے کہا۔ “حماقت کسی حق کی محتاج نہیں ہوتی جو کچھ ان سے کہنا تھا میں خود کہہ چکا ہوں اور امید ہے کہ آئندہ یہ محتاط رہیں گے۔”

اس دن سارے دفتر میں صرف ایک ہی چرچا تھا کہ آج شوکت تھانوی نے اس ہاتھی کی وہ لاجواب کھال اتاری ہے کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ شری گڑ بڑ رام اس دن کے بعد سے میرے کمرے کے سامنے سے بھی گذرتے تھے تو پنجوں کے بل اور جب کبھی میں ان کو اپنے کمرے میں بلاتا تھا وہ اس وقت تک کھڑے ہی رہتے تھے جب تک مس ے ان سے بیٹھنے نہ کہوں۔ یوں تو روزنامہ ہند کی فضائیں اب میرے لئے سازگار ہوچکی تھیں مگر دوسرے ہی مہینہ اختتام پر معلوم ہوا کہ اس ملازمت میں تنخواہ ملنا کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ پہلی تاریخ سے پندرہ تاریخ ہوگئی مگر تنخواہ کا کوئی ذکر نہ تھا۔ پندرہ تاریخ کے بعد شعبۂ کتابت نے کچھ گڑ بڑ شروع کی۔ اس گڑ بڑ مس ے مترجم، پھر کچھ اسسٹنٹ ایڈیٹر شامل ہوگئے اور آخر رام لال ورما نے مجھ سے کہا کہ “شوکت صاحب میں بالکل پھکڑ ہو چکا ہوں اور اب میرے لئے اخبار کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔ دو دو مہینہ کی تنخواہ سارے عملے کی چڑھی ہوئی ہے لہٰذا مس ے تو اخبار بند کر رہا ہوں۔ چنانچہ یکم مئی کو نکلنے والا اخبار یکم جولائی کو بند کر دیا گیا اور سارا عملہ چیختا پیٹتا رہ گیا۔

☞

١٠

لکھنؤ کے خوش وضع اور ٹکسالی لوگ شیروانی کے سب بٹن شاذ و نادر ہی لگاتے ہیں اور عموماً نیچے کے دو تین بٹن لگا کر باقی کے کھلے چھوڑ دیتے ہیں اس لئے کہ شیروانی کہ علاوہ وہ کرتا بھی تو قابل دید ہوتا ہےجس کا مری پھندے سے کڑھا ہوا گریبان لکھنوی سوزن کاری کا شاہکار ہوتا ہے۔ اگر اس گریبان کو شیروانی کے سب بٹن لگا کر چھپا دیا جائے تو اس صنعت کو آخر کیوں کر نظارہ سوز بنایا جائے یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی صاحب نہایت قیمتی ٹائی باندھ کر بند گلے کا کوٹ پہن لیں لیکن جن محترم کا میں ذکر کرنا چہتا ہوں وہ اس لکھنوی وضع کے دانستہ یا نادانستہ سخت باغی تھے۔ وہ شیروانی کے اوپر کے دو بٹن لگا کر باقی سب بٹن چھوڑ دیتے تھے۔ ور بہت قریب سے دیکھا جائے تب پتہ چلتا تھا کہ وہ چھتری نہیں بلکہ شیروانی ہی پہنے ہوئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسی شیروانی سے خواتین نے مروجّہ عرارے کا تصور حاصل کیا ہے۔ یہ شیروانی پہنے اور سر پر ترکی ٹوپی رکھے جس کے چاروں طرف سفید بالوں کی کی جھالر سی لگی نظرؔ تی تھی۔ یہاں تک کہ پیشانی پر بھی اس ٹوپی سے نکلے ہوئے بال چھائے ہوئے نظر آتے تھے۔ سید جالب دہلوی روز نامہ ہمدم لکھنؤ کے دفتر میں کرسی ادارت پر بیٹھے بیک وقت حقہ اور سگریٹ دونوں پیتے نظر آتے تھے کہ حقہ کی نَے جسج ہاتھ میں سے اس کی چھنگلیاں اور چوتھی انگلی کے درمیان ایک سلگتی ہوئی سگریٹ بھی ہیکہ کبھی حقہ کا کش لے لیا اور کبھی سگریٹ کا دم لگایا اور اور دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا قلم مسلسل چلتا رہا۔

یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کی اپریل کا ہے جب میں سب سے پہلے ان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جن کو مولانا محمد علی چلتی پھرتی انسائکلو پیڈیا کہا کرتے تھے۔ اور جو دنیائے صحافت میں بابائے صحافت کے نام سے مشہور تھے۔ اور دنیائے صحافت کو سید حبیب ۔ عارف رحم ہاشمی ۔ انیس احمد عباسی ۔ حسن ریاض اور حامد حسرت ایسے خدا جانے کتنے صحافی بنا بنا کر مہیا کرتے جاتے تھے۔ میں ان اجاڑ صورت بابائے صحافت کو دیکھ کر کچھ زیادہ خوش عقیدہ نہ ہو سکا مگر مہاراجہ صاحب محمود آغاز کا تعارفی خط پھر بھی ان کی خدمت میں پیش کر دیا اور خط پڑھ چکنے کے بعد ایک نگہ نیم باز سے مجھ کو دیکھ کر اب جو انھوں نے مجھ ہی سے میرا تعارف کرانا شروع کیا ہے تو تو مجھے اعتراف ہے کہ اپنے خاندانی حالات سے میں خود اتنا واقف نہ تھا جتنے واقف یہ محترم نکلے۔ تھانہ بھون کی وجہ تسمیہ سے لے کر مولانا اشرف علی تھانوی کے تمام لٹریچر پر بغیر سانس لیے ایک رواں تبصرہ کرتے چلے گئے۔ میرے دوسرے چچاؤں کا مجھ سے تعارف کرایا۔ میرے والد جو اپنی باتیں انتظاماً مجھ سے چھپائے ہوئے تھے وہ سب مجھ پر ظاہر کیں۔ والد محترم کو اس ممانہ میں تنفس کی شکایت بھی لہٰذا اس مرض کے اسباب و علل پر سیر حاصل بحث کی اس کے کچھ یونانی نسخے بتائے مغربی ممالک میں اس پر جتنا ریسرچ ہوا ہے وہ سب تاریخ وار بتایا اور آخر میں یہ آزمودہ نسخہ بتایا کہ اگر ایک گلاس مس ے تازہ پانی لے کر ناک سے کھینچا جائے تو یہ مرض ہمیشہ کے لئے ہو سکتا ہے۔ وہ مجھ کو یہ علاج غالباً اس لئے بتا رہے تھے کہ اگر میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں تو یہ مرض مجھ کو آج نہیں تو کل ضرور ہوگا اور اس وقت یہ علاج کام آئے گا مگر مجھ کو ان کی اس غیر متعلق تفصیل سے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی اس لئے کہ میں تو صرف اس لئے آیا تھا کہ وہ مجھ کو رومنامہ ہمدم کے عملہ مے لے کر اپنی تربیت کا شرف عطا کریں۔ آخر بمشکل تمام وہ اس رُخ پر لے آئے اور مجھے بتایا کہ تم آج رات سے خبرں و کے ترجمے سے اخبار نویسی کی ابتدا کرو اور تفصیلات معلوم کرنے کے لئے مجھے قاضی حامد حسرت کے پاس پہنچوں۔ سید صاحب کا میر متعلق پرچہ ترکیب استعمال ن کو پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے مجھے بتایا کہ میں رات کو بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک حاضری دیا کروں گا اور خبروں کا ترجمہ کیا کروں گا۔ جس کا معاوضہ مجھ کو پچاس روپیہ ماہوار دیا جائے گا۔

اللہ جانے کتنے دن میں یہ رت جگا کیا کہ ناگاہ ایک دن مجھے سید صاحب نے اپنی پیشی میں طلب کیا اور مجھے بتایا کہ امتیاز احمد اشرفی اسسٹنٹ اڈیٹر رخصت پر جا رہے ہیں۔ لہٰذا میں ہمدم کا فکاہیہ کالم ‘‘دو دو باتیں’’ لکھ کر ان دکھاؤں تا کہ وہ اندامہ کر سکیں کہ یہ کالم میں لکھ سکوں گا یا نہیں۔ حسب الحکم میں نے وہ کالم بری محنت سے لکھ کر پیش کر دیا اور خود حسب معمول ترجمہ کے شعبہ مس ے آ گیا۔ دل میں ایک خیال ضرور تھا کہ اللہ جانے اس کالم کا کیا حشر ہوا مگر جب سید صاحب کے دفتر سے اٹھ جانے کے بعد مجھ کو وہ کالم ان کی ردّی کی ٹوکری میں نظر نہ آیا تو حیال ہوا کہ شاید ابھی دیکھا ہی نہ ہو مگر تھوڑی ہی دیر میں شعبۂ کتابت سے وہ کالم لکھا ہوا مع اس اصل کے آ گیا جس پر سید صاحب نے لال روشنائی سے انی اصلاحیں دی تھیں کہ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ وہ خود ہی لکھ لیتے۔ کاغذ کا صفحہ اچھا خاصا پانی پت کا میدان نظر آتا تھا۔ مس ے اس کاپی پڑھ کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ سید صاحب بہ نفس نفیس میری نشست کے قریب آئے اور فرمایا کہ یہ کالم لکھتا رہوں ساتھ ہی رات کی حاضری معاف کر دی گئی اور صبح دفتر آنے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس مہینے مجھ کو بجائے پچاس کے اسّی روپیہ تنخواہ ملی مگر ہوتا یہی رہا کہ میرا کالم سید صاحب کی آپریشن ٹیبل سے لہولہان ہو کر کاتبوں کے پاس جاتا رہا اور وہاں سے میرے پاس آتا رہا۔ رفتہ رفتہ سرخ روشنائی کم ہوتی گئی اور وہ دن تو میر لئے عید کا دن تھا جب اس کالم کی اصل پر ایک بھی سرخ نشان نہ تھا۔ طرح طرح کے خیال آئے کہ شاید آج سید صاحب کی طبیعت ناساز تھی یا شجید سید صاحب کسیاور کام میں مصروف تھے۔ مگر دوسرے ہی دن سید صاحب نے یاد فرما کر اس کالم کا ذکر کیے بغیر حکم دیا کہ اب آپ شذرات بھی لکھا کریں اور ساتھ ہی ساتھ مجھ کو تازہ۔ آئی۔ ڈی۔ ٹی تھما دیا گیا اس پر کچھ نشانات ہیں۔ ان میں سیکسی پر نوٹ لکھ کر دکھایئے۔ میں نے کبھی ایک خبر پر کبھی دوسری پر نوٹ لکھنے کی کوشش میں کئی صفحات پھاڑ پھار کر پھینکے۔ آخر ایک نوٹ بمشکل تمام لکھ ہی لیا اور سیّد صاحب کی خدمت مس ے پیش کر دیا۔ مزاحیہ کالم ‘‘دو دو باتیں’’ تو اب براہِ راست میرے پاس سے شعۂ کتابت میں جاتا رہا مگر نوٹ سیّد صاحب کے ملاخطہ سے گذر کر ہی شعبۂ

کتابت مس ے جاتے تھے۔ اور وہاں سے جب میرے پاس آتے تھے تو مجھ کو طے کرنا پڑتا تھا۔ یہ کہ میں کبھی ادارتی نوٹ لکھنے کے قابل نہ ہو سکوں گا۔ اس لئے کہ وہی لال روشنائی ہر طرف چھٹکی ہوئی نظر آتی تھی مگر کچھ ہی دن کے بعد یہ اصلاحیں اور ترمیمیں کم ہونے لگیں اور آخر ایک دن وہ بھی آیا جب ایک نہایت طویل نوٹ میں صرف میرا ایک لفظ کٹا ہوا تھا۔ ‘‘نقطۂ نظر’’ اور اس پر لال روشنائی سے لکھا ہوا تھا ‘‘زاویۂ نظر’’ معلوم نہں ے کیوں اس دن مجھ کو سیّد صاحب پر سخت غصہ آیا کہ ان کو اصلاح کرنے کا کچھ شوق بھی ہے ورنہ محض ‘‘نقطۂ نظر’’ کو ‘‘زاویۂ نظر’’ بنانا کیا معنی رکھتا ہے۔ میں وہ نوٹ لئے دندناتا سیّد صاحب کے پاس جا پہنچا اور وہ نوٹ پیش کر کے عرض کیا کہ میں اس اصلاح کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ سیّد صاحب نے پہلے حقہ کا کش اور سگریٹ کا دم لے کر فرمایا۔ ‘‘تشریف رکھیئے’’ اور اب جو ج ان کی تقریر شروع ہوئی ہے تو کسی طرح ختم ہون ے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ایک دریا ہے کہ رواں ہے اور اس میں ڈبکیاں کھا رہا ہو۔ کہنے لگے کہ ‘‘آپ اخبار نویس ہیں’’ اخبار نویس وہ چور ہوتا ہے جو جسم پر تیل کی مالش کر کے چوری کرنے جاتا تھا کہ اگر پکڑا جائے تو پھسل جائے۔ اگر آپ نے اس موقع پر نقطۂ نظر لھا تو آپ پھسلنے نہ پائیں گے۔ اس لئے کہ نقطۂ نظر کے معنی یہ ہیں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ کی قطعی اور آخری رائے ہے آپ کی نگاہ ایک نقطہ پر مرکوز ہے لیکن اگر آپ نے زاویۂ نظر لکھ دیا ہے تو اس میں نقطۂ نظر والی قطعیت اور تیّقن نہیں ہے۔ رہ گئے آپ کے قارئین، وہ نقطۂ نظر اور زاویۂ نظر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ لہٰذا آپ زاویۂ نظر ہی کیوں نہ لکھیں اور گرفت سے پھسل جانے کا امکان باقی رہنے دیں۔ نتیجہ یہ کہ قائل ہو کر واپس آنا پڑا۔ ایک مرتبہ ایک نوٹ میں لفظ ‘‘تیار’’ جو میں نے ’ط‘ سے لکھا ہوا تھا، سخت نادم ہوا کہ یہ املا کی غلطی ہو گئی۔ لہٰذا دوسری مرتبہ طیار ’ط‘ سے لکھا مگر وہ بھی کٹ کر آ گیا۔ اب اس پر ’ت‘ سے تیار لکھا ہوا تھا۔ اب پھر مجھ کو باریاب ہونا پڑا کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ جب میں ’ت‘ سے لکھتا ہوں تو آ ِ اسے کاٹ کر طیار ’ط‘ سے لکھ دیتے ہیں اور جب میں طیار ’ط‘ سے لکھتا ہوں تو آپ اسے کاٹ کر ’ت‘ سے بنا دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پھر ایک لکچر سننا پڑا کہ ’ط‘ سے طیار اس

طائرکو کہتے ہیں جواڑنے کے لئے پر تول رہا ہواور ’ت‘ سے تیار اس تیر کو کہتےہیں جو کمان سے نکلنے ہی والی ہو۔ ہٰذا اگر آپ یہ لکھیں کہ طیارہ پرواز کے ’ت‘ سے تیار تھا تو یقیناً غلط ہے یہ طیار ’ط‘ سے ہوگا اور اگر آپ یہ لکھیں کہ گھوڑے دوڑنے کے لئے ’ط‘ سے تیار تھے تو یہ بھی غلط ہے یہ تیار ’ت‘ سے ہوگا۔ اپنا سا منہ لے کر پھر واپس آ گئے۔ دفتری وضاؤں کے باہر بھی احتیاط برتنا پڑتی تھی کہ کوئی بات ایسی نہ چھڑ جائے۔ کہ سیّد صاحب کو اس بات کی جڑ سے لے کر پھنگی تک کی خبر لانا پڑے ار وہ ایسی تقریر شروع کر دیں جس کی کوئی حد ہی نہ ہو اور جس کے ختم ہونے کی کوئی دعا قبول نہ ہو سکے مگر شامتِ اعمال اس قسم کے مواقع فراہم کرتی ہی رہتی تھی۔ مثلاً سیّد صاحب امین آباد مس ے حلوہ سوہن خرہدتے نظر آ گئے اور ان سے نہایت معصوم سا سوال کر یا کہ ’’حلوہ سوہن خرید رہے ہیں آپ؟‘‘ بس وہ شروع ہو گئے وہیں کہ:

’’جی ہاں‘‘۔ مگر میں اس کے مٹھائی ہونے سے زیادہ دوا ہونے کا قائل ہوں اور تاریخی طور سے ثابت بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ دراصل بنیادی طور پر ہے بھی دوا ہی۔ شہنشاہ جہانگیر کثرتِ شارب نوشی کے باعث ایک زمانہ میں خشکی بڑھ جانے کے باعث رات کی نیند محروم ہو چکا تھا او جاففیشر حکمائے دربار اس فکر میں تھے کہ کسی طرح سا شب بیداری کا شکایت دور کرنے کا کوئی ایسا طرہقہ نکالا جائے جو بظاہر علاج بھی معلوم نہ ہو اس لئے کہ شہنشاہ سے بمشکل یہ توقع تھی کہ وہ کڑوی کسیلی دوائیں پی سکیں۔ لٰہذا طبیب اعظم حکیم نظام الدین خاں نے بھیڑوں کے چھتے کی قسم کی ایک ایسی مٹھائی ایجاد کی جس کے سوراخوں میں زیادہ سے زیادہ گھیی پیوست کیا جا سکتا تھا اور اس طرح یہ زیادہ سے زیادہ گھی شہنشاہ کو کھلایا جا سکتا تھا شہشاہ نے اس نئ مٹھائی کو بے حد پسند کیا لٰہذا اس کو زیادہ سے زیادہ پر تکلف بنا کر پیش کیا جانے لگا اور احتیاط یہ بھی ملحوظ رہی کہ معدے پر بار نہ ہو رفتہ رفتہ اس مٹھائی نے شاہی خاندان میں عام رواج حاصل کر لیا شاہی خاندان کے بعد امرائے دربار میں یہ مقبول ہوئی یہاں س تک کہ عام حلوائیوں نے اس کو بنانا اور اس کو ترقی دینا شروع کر دیا۔ راجہ ٹوڈرمل کے خاندان کے ایک رئیس راجہ سوہن لال نے جو اس مٹھائی ککہ بے

حد دادہ تھے اس کو باقاعدہ حلوے کی حیثیت دے کر اس کا نام حلوہ سوہن رکھا مگر حلوہ سوہن تیار کرنے میں مسلمان حلوائیوں کو ہمیشہ امتیاز حاصل رہا۔ دہلی مس ے گھنٹہ گھر کے مشہور حلوائی میاں حیات کا حلوہ سوہن بے حد مشہور تھا۔ اب ہندو حلوائی بھی اس کی تیاری میں سلیقہ دکھاتے ہیں مگر حلوہ سوہن کو حیات ابدی حیات حلوائی ہی نے دی ہے۔‘‘

یہ حلوہ سوہن نامہ صرف اتنا ہی نہ تھا بلکہ اس کی پشت پر غدر تک کی پوری تاریخ تھی اور ایک حلوہ سوہن پر کیا منحصر ہے کوئی ذکر چھیڑ دیجیے۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار

عجیب منظر تھا وہ بھی جب سید ھا صاحب روزنامہ ہمدم سے سبکدوش ہوتے رہے تھے اور ہمدم کے عملہ نے اس کو الوداعی گروپ فوٹو لینے کے لئے ان کو زحمت دی تھی حسب معمول ازار بند لٹک رہا تھا میں نے اس طرف توجہ مبذول کی تو آپ کے صاحبزادے سید عشرت حسین نے کہا:

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام

سیّد صاحب نے بیٹے کو دیکھا اور عجیب انداز سے کہا۔ ’’باپ کا چہرہ؟ روئے دلآرام؟ جیتے رہو عشرت میاں۔‘‘

☞